[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فہرست مضامین مقالات گارساں دتاسی

حصۂ دوم

شمارہ	مضمون	مترجم	صفحہ
۱	مقالہ سنہ ۱۸۷۴ء	پروفیسر عزیز احمد صاحب شعبۂ انگریزی جامعۂ عثمانیہ	۱
۲	مقالہ سنہ ۱۸۷۵ء	ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری	۱۱۶
۳	مقالہ سنہ ۱۸۷۶ء	" "	۲۱۱
۴	مقالہ سنہ ۱۸۷۷ء	" "	۳۲

عطیہ غلام ربانی تاباں

مقالاتِ گارساں دتاسی

ہندستانی زبان و ادب ۱۸۷۴ء میں

۱۔ اس سال ہندستان میں بہت سخت قحط پڑنے کا اندیشہ تھا لیکن سرکار نے ایسی مستعدی اور کوشش سے اس کا انتظام کیا کہ اس وبال کی سختی بہت کم ہوگئی۔ خوش قسمتی سے بہت تھوڑے لوگ اس کا شکار ہوئے۔ ہمیں اُمید کرنی چاہیے کہ آئندہ سال زیادہ مبارک ہوگا۔

"نئے اور نوجوان سال خوش آمدید۔ تیری حکومت کو خوشی اور امن نصیب ہو۔ تیرے دوران میں روشنی اور صفا کا دَور دَورہ رہے اور تو احتیاج اور مصیبت سے آزاد رہے"[۱]

مَیں اب بھی ہندی کے مقابلے میں اُردو کی حمایت کر رہا ہوں، اگرچہ مَیں اوّل الذکر کی اہمیت اور افادیت سے منکر نہیں[۲]۔ خوش قسمتی

A Welcome to the young new year

Joy and peace attand thy reigns

So may thy course be bright and clchr

Free from want and free from pain

۱؎ ان اضلاع کے انگریز عہدے داروں کے لیے جہاں یہ بولی جاتی ہو یہ لازم قرار دیا گیا ہو کہ وہ اسے سیکھیں اور بالآخر اودھ میں نامزد شدہ عہدے داروں کے لیے اپنے عہدوں کا جائزہ لینے سے پہلے حکماً یہ لازمی بتایا گیا ہو کہ وہ ہندی اور اُردو دونوں میں ایک امتحان کامیاب کریں۔ علی گڑھ اخبار ، اگست ۱۸۷۳ء

سے اہم شخصیتوں نے اس بحث میں میری تائید کی ہے۔ لفٹنٹ کرنل
جے چیمبرس J. Chambers پروفیسر ہندستانی جامعۂ آکسفورڈ کا ایک
خط میرے پیش نظر ہے جسے میں نقل کرتا ہوں:۔

"مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ آپ اور بہت سے نامور
ہندستانی حضرات جدید ہندی کے مقابلے میں اُردو کے رواج کے
حامی ہیں۔ ہندی مجھے بالکل پسند نہیں کیوں کہ یہ فارسی، عربی، انگریزی
اور کچھ مقامی محاوروں اور سنسکرت ترکیبوں کا ناخوش گوار مجموعہ ہے۔
یہ سنسکرت ترکیبیں ہندستان کے کسی ایسے حصے میں رائج نہیں
جہاں میں ۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۲ء تک مقیم رہا، یہاں جن
حصوں کا میں نے سفر کیا جن میں بنگال کے تمام اضلاع اور
مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں کے کچھ اضلاع شامل ہیں۔
دیوناگری رسم الخط، اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت اور ٹھیٹھ
ہندی کے لیے اچھی طرح موزوں ہے۔ لیکن اجنبی الفاظ کو تحریر کرنے
کے لیے بہت ناقص ہے کیوں کہ اس رسم الخط میں دوسرے حروف کی
آواز کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ المختصر میں یہ سمجھتا ہوں کہ
فارسی رسم حروف ہندستان میں عام استعمال کے لیے زیادہ موزوں
ہیں۔ ہندستانی سپاہی اِنھی (فارسی) حروف کو استعمال کرتے ہیں،
اور اگر نہیں کرسکتے تو دیوناگری نہیں بلکہ کیتھی ناگری کو استعمال کرتے
ہیں، اگر بنگالی ہوں تو مہاجنی کو اور پنجابی ہوں تو گورمکھی کو۔ اگر
وہ فارسی رسم الخط استعمال نہیں کرسکتے تو اس رسم الخط کو استعمال
کرتے ہیں جو اُن کے مفاد کے مطابق ہے۔"

سیّد عبداللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ اس سے قبل اپنے گزشتہ مقالوں میں مجھے کئی بار ان کا ذکر کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس نامور ہندستانی نے لندن میں رُبع صدی گزارنے کے بعد، جہاں انھوں نے ایک انگریز (رومن) کیتھولک خاتون سے شادی کی ہے اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا ہے۔ ان کے دوستوں کو اس کا افسوس ہے کہ انگلستان ایک ایسے قابل ایشیائی کی موجودگی سے محروم ہو جائے گا جو اسلامی مشرقی ادب اور زبان و ادب انگریزی کا یکساں ماہر تھا۔ وہ یونی ورسٹی کالج میں ہندستانی کے پروفیسر تھے اور سیکڑوں شاگردوں نے اُن سے فیض پایا جن میں سے میں صرف ان کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر شاگرد یعنی ایڈورڈ ایچ۔ پامر Edward H. Palmer پروفیسر عربی کیمبرج کا ذکر کروں گا جو نہ صرف اس زبان کو بڑی روانی سے لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے وہ پڑھاتے ہیں بلکہ ہندستانی اور فارسی کو بھی۔

سیّد عبداللہ صرف بہ حیثیت پروفیسر ممتاز نہیں بلکہ اپنے مفید اُردو اور ہندی انتخابات کی وجہ سے بھی مشہور ہیں جن کا میں نے یا اپنی "تاریخ ادبِ ہندوی و ہندستانی" Histoire de la litterature hindonie et Hindoustanie. میں یا اپنے سالانہ مقالات میں ذکر کیا ہے۔ یقیناً وہ اپنی فنی قابلیت کے ثمرات عوام الناس کے سامنے پیش کرتے رہیں گے، اب تو وہ بہار میں مہتمم مدارس ہیں۔[1]

[1] پنجابی مورخہ جولائی میں سیّد عبداللہ کے متعلق تعریف سے پُر ایک مضمون چھپا ہے یہ مضمون اس تفصیلی خط کے ترجمے کے ختم پر ہے جو پنجاب کے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک مشہور افسر اور قابل طبیب نے لکھا ہے۔

علی گڑھ اخبار[1] کے ایک مضمون سے ہمیں اس کا علم ہوتا ہے کہ الہ آباد میں ۸ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مولوی فریدالدین پلیڈر ہائی کورٹ[2] کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک جلسہ منعقد کیا جس کے صدر جعفر علی تھے جس میں الہ آباد کے مشہور مسلمان شریک تھے۔ جلسے کا مقصد یہ تھا کہ ممتاز ہندوؤں کی حکومت کے نام اس درخواست کے خلاف احتجاج کیا جائے جس میں دفاتر اور مدارس میں دیوناگری رسم الخط کے رواج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر مباحثے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ الہ آباد میں ایک مرکزی کمیٹی قائم کی جائے جس کے سکریٹری سید احمد خاں ہوں اور وہ مجلس کی تجویزات کے مطابق عمل کریں۔

دیسی اخبارات میں اُردو کو خوش بیان حامی برابر ملتے جاتے ہیں۔ اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ مورخہ یکم جولائی ۱۸۷۴ء میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان "اُردو اور ناگری (ہندی) کے موضوع پر بحث" ہے، یہ حصہ ملاحظہ ہو:-

"یا اللہ، یا اللہ، لوگ بھی کیا مٹی اُچھالتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اُردو کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور ناگری کو زندہ کریں۔ سرکار میں انھوں نے عرضیاں بھی بھیجی ہیں۔ اخبارات میں لمبے چوڑے مضامین لکھے ہیں اور کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ ہندوؤں کے اس کھیل میں صوبہ جاتِ شمال مغربی کے اعلا عہدے دار سپہ سالار بن گئے ہیں۔ پھر بھی کون ہے

---

[1] شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۸۷۳ء

[2] جو وکلا ہائی کورٹ میں پیروی کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسب پسند انگریزی یا اُردو میں امتحان کامیاب کریں۔

جو خدا کے کام کو مٹا سکے؟

کیا ایسی زبان کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہو جو دو سو سال سے ہندستان میں عام ہو اور جو شمالی ہندستان کے تمام باشندوں کے آب و گل میں سرایت کر چکی ہو؟

حیرت کی بات ہو کہ اُردو کُش اصحاب اس کے درپے ہیں کہ اُردو زبان گورمنٹ کے رجسٹروں سے خارج کر دی جائے۔ مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی ہندستانیوں کا مُنھ بند کر سکتا ہو یا اس امر کو قابلِ الزام قرار دے سکتا ہو کہ کوئی اپنے گھر میں اپنی بیوی، اپنے دوستوں اور اپنے ملاقاتیوں سے اُردو نہ بولے۔ جب تک یہ ناممکن بات پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چند سرکاری رجسٹروں سے خارج کر دیے جانے پر اُردو زبان ترک کر دی جائے گی۔ خدا نہ کرے۔ یہ زبان ہندستانیوں کے لیے ایسی ہو جیسے آٹے میں نمک۔ کون اسے مٹا سکتا ہو؟

مدت دراز سے ہمارے کئی ممتاز ہم وطن اس موضوع پر خاموش سے ہیں اور ہم بھی اس مسلک پر عمل پیرا ہیں کہ فتنۂ خوابیدہ کو جگانا نہ چاہیے۔ پھر بھی ان شکایات کے نتائج سے قطع نظر جو حکومت سے کی گئی ہیں، ہم اپنے ہم وطنوں کی توجہ بالآخر اس کی طرف منعطف کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔

ان دلائل کے بعد جو ناگری ہندی کے حامی اپنی حمایت میں پیش کرتے ہیں یہ صاف واضح ہو کہ اس تبدیلی (جو کبھی وقوع میں نہ آئے گی) کی خواہش کا اصلی باعث محض تعصب کے سوا کچھ اور

نہیں جو دلیلیں وہ پیش کرتے ہیں ان میں ان کے نزدیک سب سے
زیادہ وقیع یہ ہو کہ دیہاتی یا چھوٹے چھوٹے قصبوں کے رہنے والے
اُردو نہیں سمجھ سکتے اور ان کے لیے ان دستاویزات اور کاغذات
کا پڑھنا جو اس زبان میں ہیں، تکلیف دہ ہو۔ اس اعتراض کا ہمارے
پاس یہ جواب ہو کہ اُردو زبان ہندستان میں دو سو سال سے رائج ہو
اور اس کے ذریعے ہر قسم کے سرکاری معاملات انجام پاتے رہے
ہیں اور حال تک کسی نے اس موضوع پر شکایت کرنے کا
کبھی کوئی قصد نہیں کیا۔ اودھ اور صوبہ جاتِ شمال مغربی میں کوئی
چھوٹا قصبہ یا گانو ایسا نہیں ہو جہاں کے لوگ اُردو سے اس
درجہ ناواقف ہوں کہ سرکاری کاغذات کو سمجھ نہ سکیں۔ کوئی بدنفس
حاکم اس کے رواج کی ممانعت کرسکتا ہو لیکن ہمارا دعوا ہو کہ اس
زبان نے ایسی زندگی پائی ہو کہ کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ گانو میں
قدرتی طور پر بہ کثرت لوگ ناگری (ہندی) جانتے ہیں۔ مگر لکھنؤ،
دہلی، آگرہ جیسے بڑے بڑے شہروں میں ہزار میں شاید ایک آدھ
شخص جانتا ہو اور عدالتیں تو انھی بڑے بڑے شہروں میں قائم ہیں۔
اگر اُردو کا استعمال سرکاری تحریروں میں بالکل ترک کردیا جائے
تو شاید ایک طرح سے یہ چیز دیہاتوں کی حد تک جائز ہو مگر بے چارے
شہر والوں کو جو کیا بہ لحاظِ تعداد، کیا بہ لحاظِ تعلیم و ادب، کیا بہ لحاظِ مرتبہ
وحیثیت دیہاتیوں سے برتر ہیں۔ بڑی قربانی کرنی پڑے گی .....
بڑی حماقت ہوگی اگر ان ترکیبوں کو ترک کیا جائے جو لوگوں کی مادری
زبان کا محاورہ بن گئی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بہار میں اُردو کے استعمال

کو روک کے از سرِ نو جاری کرنا پڑا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس طرح کی
حامل ضدین تجویزیں کس منزل تک پہنچتی ہیں۔ سر جارج کیمبل[1]
Sir George Campbell بڑے فہیم آدمی ہیں مگر متلوّن المزاج۔
ان کے بہت سے احکامات ان کے تخیل کی پیداوار ہیں جو ان
کی طبیعت سے بہت مشابہ ہے لیکن یہ کون جانچے کہ انھوں نے
جو کیا ٹھیک تھا یا نہیں۔ میری راے میں تو تمام کوششیں جو انھوں
نے کیں، درخواستیں جو بے وقوفوں اور احمقوں نے دستخط کرکے
گورنمنٹ میں بھیجیں، شکایتیں جن سے انھوں نے جرائد کے صفحات
سیاہ کیے سب بے کار اور لا حاصل ثابت ہوں گی۔ اُردو کا استعمال
روکنے اور ناگری کو رواج دینے سے پہلے اشیا کی ماہیت بدلنی
ہوگی..... لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے
کی کوشش ایک خیالِ خام اور ناممکن العمل سی بات ہے، اچھی خاصی
حماقت ہے.....

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو اور ہندستانی ایک ہی ہے۔
آخر الذکر نام یورپینوں کا دیا ہوا ہے جس کو وہ اوّل الذکر نام پر ترجیح
دیتے ہیں جو ہندستانیوں میں زیادہ مستعمل ہے۔ "بنگال میگزین"
بابت جنوری سنہ ۱۸۷۳ء میں اُردو کے متعلق بہت سی واہیات
عبارتیں شائع ہوتی ہیں اور مجھے دیکھ کر حیرت ہوتی کہ "ہریش چندر
میگزین" (بابت فروری سنہ ۱۸۷۳ء) میں جو ہندی کا بڑا اچھا ماہ وار
رسالہ ہے، ان کو نقل بھی کیا گیا ہے۔ یہ اس زبان کے متعلق ہیں جس

---

[1] ملاحظہ ہو میرا "مقالہ" بابت سنہ ۱۸۷۳ء

کو وہ اُردو، ہندستانی اور کبھی کبھی ہندی کہتا ہی لیکن اُردو کے خلاف مضمون کے گُم نام مصنّف نے جہاں اُردو کا ذکر کیا ہی، اس سے وہ شاعرانہ زبان مُراد لی ہی جو زیادہ تر ریختہ کہلاتی ہی اور جو ہندستان کے کسی حصّے میں رائج نہیں جس طرح ٹھیٹھ انگریزی شاعری کی زبان روز مرہ کی گفتگو میں استعمال نہیں ہوتی۔ اسی گُم نام مضمون نگار کے دعوے کے مطابق یہ "عام ہندستانی" یا ہندی جو عام اُردو سے کسی طرح مختلف نہیں، ہندستان بھر میں بجز بنگال کے ایک حصّے اڑیا زبان کے علاقے کے تنگ سے حصّے، تامل، مرہٹہ اور گجرات کے علاقے کے جہاں پھر بھی ہندستانی کافی طور پر سمجھی جاتی ہی، رائج ہی۔ ہندستان کے باقی تمام حصّوں ست پڑا اور مہادیو پہاڑوں کے شمال میں صوبہ جاتِ متوسط کے مشرقی اضلاع میں، صوبہ جاتِ شمال مغربی اور سابق مملکتِ اودھ میں ساگر اور نربدا اور نربدا کے علاقوں میں بندیل کھنڈ اور مالوے میں وسطِ ہند اور راج پوتانے میں اور کوئی زبان عام طور پر رائج نہیں۔ یوں ان تمام مختلف سرزمینوں میں جن کی آب و ہوا تک جُدا جُدا طرح کی ہی جہاں کے آداب اس قدر مختلف ہیں، یہی زبان بولی جاتی ہی، اب آپ اسے اُردو کہیے یا ہندستانی یا ہندی کہ لیجیے لیکن معلوم یہ ہوتا ہی کہ ہندستانی سے مضمون نگار کا مطلب دیوناگری رسم الخط کی زبان سے تھا جس میں فارسی اور عربی الفاظ نہ ہوں اور اس کا مقصد تھا کہ وہ سرجی کیمبل اور ہندوؤں کی پست خیال جماعت کے خیالات کی تائید کرے۔ اچھے دلائل کے موجود نہ ہونے کے باعث اس نے ان لوگوں پر حملے کیے ہیں

جو اس کے ہم خیال نہیں ہیں اور اسی طرح مشنریوں پر بھی یہاں تک کہ اس نے بابو شیو پرشاد المتخلص بہ وجہی پر بھی حملہ کیا ہی کہ انھوں نے عربی فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں اگرچہ کہ ان بابو صاحب نے جن کا شمار موجودہ ہندستان کے چوٹی کے اور پُرمغز ادیبوں میں ہوتا ہی جعتی روٗ میں پڑکر اپنی بہت سی تصنیفوں میں ناگری رسم الخط کو استعمال کیا ہی۔ گمنام[1] مضمون نگار۔ اس میں اس تاریخِ ہند کا حوالہ دیتا ہی جس کی تکمیل کی اطلاع میں نے اپنے سنہ ۱۸۶۳ء کے مقالے میں دی تھی۔ اس کا نام بڑے دعوے کے ساتھ "اتھاس ترمسک" (ایسی تاریخ جو جہالت کو دوٗر کرتی ہی) رکھا گیا تھا۔ باوجود اپنے انتہائی ہندستانی نام اور دیوناگری رسم الخط کے بلاشبہہ اس کتاب کی زبان وہی وہی ہندستانی اُردو یا "عام ہندستانی" ہی جس میں اور اُردو زبان میں مضمون نگار نے اپنی حماقت سے اختلاف دکھانے کی کوشش کی ہی۔ یہ تصنیف اس کی مثال ہی کہ رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود زبان نہیں بدلی۔ بابو کاشی ناتھ[2] نے اس کے متعلق صفائی سے کہا ہی کہ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہی ان میں ان کو خوش کرنے کے لیے حکومتِ انگریزی نے اس (رسم الخط) کو رواج دینے کی سعی کی ہی۔ پھر بھی اس میں دشواریوں کا سامنا ہی کیوں کہ بہت سے عربی فارسی حروف ایسے ہیں جن کا بدل دیوناگری میں نہیں۔ اس

---

[1] اس مصنف کے متعلق میری "تاریخِ ہندوی و ہندستانی" میں مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

[2] "بریٹش انڈیا میگزین" کے اسی شمارے کے صفحہ ۱۲۳ پر وہ مضمون ہی جس کے موضوع کی میں تردید کر رہا ہوں۔

کا نتیجہ یہ ہی اکثر ایسے جملوں کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہی جن میں ایسے الفاظ ہیں جو ہندی الاصل نہیں مگر ہمیشہ سے زبان کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ بہت سے ہندوؤں کی یہ خواہش ہی کہ انھیں متروک گردانا جائے۔ چناں چہ ان میں سے ایک نے سررشتۂ تعلیم پنجاب کو اس موضوع پر ایک خط لکھا ہی جو پنجابی[1] میں شایع ہوا ہی۔ جس میں یہ بہانہ کیا گیا ہی کہ ہندو وہ عربی اور فارسی الفاظ نہیں سمجھ سکتے جو ہندستانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر اس نے "اتھاس تمرناسک" کا ایک فقرہ نقل کیا ہی جس کا مطلب اس نے ایک ہندو اسکول ماسٹر کو غلط سمجھاتے ہوتے سنا۔ لیکن یہ جملہ انتہا درجے سہل ہی اور بجز ایک اسم خاص کے اس میں کوئی ایسا ہندستانی لفظ نہیں کہ سننے والوں کو معنوں کی تحقیق کرنی پڑے۔ جملہ یہ ہی "چوگان کھیلتے ہوتے قطب الدین ایک گھوڑے سے گرکر مرگیا۔" اسکول ماسٹر غلط سمجھا۔ غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہی اور اس نے پست خیال ہندو طبقے کو پریشانی کا موقع یہ ترجمہ کرکے دیا۔

"ایک میدان میں اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوتے گرا اور مرگیا۔"

اسی ایک مثال سے ان لغو اعتراضات کی اصلیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہی جو گم نام مضمون نگار نے اپنے مضمون "عام ہندستانی" میں کیے ہیں جو "بنگال میگزین" میں چھپا ہی۔ جو اعتراضات مشہور اور نام در بابو شیو پرشاد کے متعلق کیے گئے ہیں ان سے ان کی ذات بہت بالاتر ہی اور وہ ان حملوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔

---

[1] یکم جنوری سنہ ۱۸۷۳ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

نائل ہوجاتے ہماری صدی کا خاص رجحان یہ ہو کہ ہر چیز یکساں ہو۔
بوآلیو doilean نے ٹھیک لکھا ہی:۔

"L'ennui naquit un jour de I'uniformite

ایک مضمون جس کا عنوان "اُردو کی جوانی یا زندگانی" ہی۔
ملاحظہ ہو:۔

اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم ملاتی ہی۔ فرق محض یہ ہی کہ بعض ضلعوں میں جہاں عربی فارسی پسند کرنے والے مسلمان کثرت سے آباد ہیں، عربی اور فارسی کی چاشنی زیادہ ہی جہاں سنسکرت کو پسند کرنے والے اور بھاشا بولنے اور لکھنے والے ہندو زیادہ آباد ہیں، وہاں سنسکرت اور بھاشا کو زیادہ فروغ حاصل ہی۔ لیکن اگر ہندستانی میں عربی اور فارسی الفاظ ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہی۔ حکومت جو پہلے اپنے رجسٹروں میں تحریر کے لیے یہ زبان استعمال کرتی تھی۔ اب اگر ہندو مسلم ملاپ کے لیے کوئی اور زبان استعمال کرنے کی کوشش کرے گی تو میرے خیال میں یہ بے نتیجہ اور لاحاصل محنت ہو گی۔ کیوں کہ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں جو اس لیے اختیار کی جا سکے۔

اُردو نے اس زمانے میں ایسی نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہی کہ وہ آفتاب سے زیادہ نمایاں ہی اور روزِ روشن کو روشنی بخشتی ہی۔ سررشتۂ تعلیم کی کوششوں سے یہ زبان ہر گانو میں پھیل چکی ہی۔ جہاں کہیں ایک بھی اسکول ہی یا کوئی بھی پڑھنا لکھنا جانتا ہی اُردو زبان ہی استعمال ہوتی ہی۔ میجر ہال رائڈ Holroyd اور سررشتۂ تعلیم کے

دوسرے عہدے داروں کو اپنے پیش رَوں کے مقابلے میں اس سے زیادہ اُنس ہے اور یہ چیز بالکل قدرتی ہے کیوں کہ ان میں سے بہتوں نے اپنی زندگانی کا ایک حصّہ دہلی میں گزارا ہے جو گویا اُردو کا وطن ہے۔

ان اصحاب نے اُردو میں بہت سی کارآمد کتابیں لکھی ہیں اور عربی اور انگریزی سے مستند کتابوں کا بہت عمدگی سے ترجمہ کیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے کہ فنون کے متعلق کتابوں کی بہت مناسب طور پر تصحیح کی جائے۔ پنجاب کے ناظمِ تعلیمات میجر ہال رائیڈ نے اس طرح توجّہ کی ہے کہ زبان کو اور جِلا دی جائے اور اسے ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ زبان کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے اور اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مکمل ہو کر رہے گی۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے انجمنِ لاہور سے اصرار کیا ہے کہ ہر مہینے ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کی جائے جس میں اچھے انداز میں حقیقی اور دل چسپ موضوعوں پر لکھی ہوئی نظمیں پڑھی جائیں اور عشقیہ غزلیں یا قصیدے نہ لکھے جائیں۔ شعرا جن کے دماغوں پر اس دعوت کا ضرور اثر ہوگا۔ خاص طور پر موردِ عنایت ہوں گے اور ایک خاص کمیٹی کے تصفیے کے بعد انھیں انعامات اور صِلے دیے جائیں گے۔

یہ مشاعرے کوئی نئی چیز نہیں، ہر عصر میں یہ ہندستان میں منعقد ہوتے رہے مگر یہ سیدھے سادے ہوتے تھے اور خود بہ خود منعقد کیے جاتے تھے۔ لیکن جن مشاعروں کی حیثیت سرکاری ہوگی ان کا مقصد خاص ہوگا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مصنّفین ان متقدّمین کی اولاد تھے جو فارسی بولتے تھے، چناں چہ
فارسی عروض پر انھوں نے اپنی نظموں کی بنیاد رکھی۔ فارسی ہی کے
دل کش اور تصویر نما استعارات کو استعمال کیا۔ قصّہ مختصر فارسی فنِ بلاغت
کی نقل کی۔ اس طرح اُردو نے اس طرح کی لفّاظی اور رنگ آمیزی
سیکھی کہ بھاشا میں جو خیالات استعمال ہوتے تھے اور جو اس ملک
کے حالات کے مطابق تھے، اس حد تک غائب ہوگئے کہ کوئل کی
صدا اور چنبیلی کی خوش بو کو لوگ بھول گئے اور صرف گل و بلبل کی
توصیف ہونے لگی جو ہندستان میں معدوم ہے۔ یہ چیز قابلِ اعتراض
نہیں سمجھی گئی کہ رستم و اسفندیار کی بہادری، کوہ ہائے الوند و بیستون
کی بلندی جیحون و سیحون کی روانی کا ذکر، ارجن کی بہادری،
ہمالیہ کے برف پوش پہاڑوں اور دریائے گنگا کے ذکر سے
زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک لحاظ سے
ہم فارسی کے مشکور ہیں کیوں کہ اس کے ذریعے ہماری زبان
کو یہ رفعت، طاقت اور زور حاصل ہوا۔ اس کی تشبیہات و
استعارات کی بدولت ہماری زبان بہت ہی دل کش اور دل فریب
تصویریں کھینچ سکی۔ پہلے جب یہ چیزیں فارسی نظم و نثر میں استعمال
کی گئیں تو ان عجیب و غریب تشبیہات کی نسیم سے ہمارے
باغ کے پھول کھِل گئے جن کو ان استعارات کی شبنم نے
تازگی بخشی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان کے اسلوب
کی بلندی، اور اس کے تخیّل کی پاکیزگی ایک لا محدود درجے تک
پہنچ گئی ہے۔ یہ ایک ایسی روشنی ہے جو الفاظ کے گورکھ دھندوں

تکمیل کر آگے بڑھاتے۔

ہماری شاعری کو متقدمین سے جو کچھ ملا ہی وہ اب کہنہ اور ناقابلِ استعمال ہی...... فارسی نے بھاشا پر اپنا نقش جمایا اور اردو شاعری اور فنِ بلاغت نے اس ملاپ سے ایک خاص لطف اٹھایا ہی کیوں کہ اردو ان لوگوں کی زبان ہی جن میں سے کچھ بھاشا بولتے تھے اور کچھ فارسی۔ بھاشا اور فارسی کی اس زمانے میں وہی حیثیت تھی جو انگریزی اور اردو کی اب ہی۔ آج ضرورت اس کی ہی کہ انگریزی خیالات کی شعاع اردو شاعری میں سرایت کرے۔ کیوں کہ باوجودے کہ ہمارے بزرگ لوگوں نے ہماری زبان کو قدرتِ بیان بخشی، گرمی، زور، تشریح اور صنائع کی شان و شوکت عنایت کی، جس کی وجہ سے وہ کسی اور زبان سے کم نہیں۔ انھوں نے اس میں ایک بہت بڑی خامی بھی رہنے دی اور وہ یہ کہ انھوں نے حدِ اعتدال سے تجاوز کیا۔ بجز مضامینِ عشقیہ کے وہ کسی اور مضمون کو نہیں باندھتے تھے، عاشق و معشوق کے وصل کے متعلق پُرتکلف اشعار لکھتے تھے، فراق کا رنج اور شکایتیں اور گریہ و زاری، شراب و ساقی[1] کی قصیدہ خوانی، بہار و خزاں کا ذکر، قسمت کی شکایت، خوش حال لوگوں کی مدح و ستایش لیکن یہ سب چیزیں محض خیالی ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس قدر الجھی ہوتی اور نامانوس استعارات سے لبریز کہ ان کا مطلب

[1] ہندستانی اور فارسی شاعری میں شراب و ساقی کا ذکر استعارۃً کیا جاتا ہی کیوں کہ یہ سب کو معلوم ہی کہ مسلمانوں کو شراب نوشی کی ممانعت ہی۔ شراب عشقِ حقیقی ہی ساقی روحانی پیشوا۔

[illegible]

ہندستانی شاعری کے اس نئے انداز کے نمونوں کے طور پر آزاد نے اپنی تقریر کے آخر میں اس قسم کے کچھ قطعات بھی شامل کیے ہیں۔ لیکن مجھے ان میں کوئی خاص یا قابلِ ذکر چیز نظر نہیں آتی۔ "پنجابی" میں ان نظموں پر تنقید کی گئی ہے۔ ایک صاحب نے ان کی پوری تقریر کی مخالفت کی ہے[1] یہ رسالہ اس بات میں محض تنہا نہیں ہے کہ اس نے جدت کی تجویزوں کی مخالفت کی ہے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کے فاضل سید غلام حسین کا بیان ملاحظہ ہو۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شاعری کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور اس فن کے اصول سے خوب واقف ہیں۔

"مولوی محمد حسین[2] کی تقریر فصیح و بلیغ اور قابلیت سے پُر تھی محض یہ کہ مولوی صاحب نے جو کچھ غلطی سے اُردو میں کہا انھیں انگریزی میں کہنا چاہیے تھا۔ مزید برآں ان لوگوں کے لیے جو انگریزی جانتے ہیں ان کی تقریر بہت خوب اور خوش مذاقی کا سچا نمونہ تھی۔ "اس اُردو کو جو بظاہر ہندستانی اور دراصل انگریزی ہوگی، ہماری سرکار رواج دینا چاہتی ہے۔ لیکن جب وہ ہندستانی جو بدقسمتی سے انگریزی نہیں جانتے اس تقریر کو پڑھیں گے تو اس کی صورت دیکھ کر کہیں گے۔ یہ لفاظی، یہ ترتیبِ خیالات کا مربوط سلسلہ، یہ پیاری زبان، زبان کا یہ زور جو ہم نے اپنے کسی شاعر یا سخن گو کے کلام میں کبھی نہیں پایا۔ ان سب چیزوں کی مجموعی شکل

---

[1] بابت ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء صفحات ۳ اور ۶۔

[2] اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ یکم جولائی ۱۸۷۴ء

ایسی ہی جس سے ہم ششدر ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی محدود عقل اور اپنی کُند طبیعت پر رونا آتا ہی کہ اس تقریر کو کئی بار پڑھنے کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ مولوی صاحب کس بات کی شکایت فرما رہے ہیں اور وہ ہماری شاعری میں کیا اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مولوی صاحب دو باتوں کے خواہش مند ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُردو تشبیہات و استعارات سے پاک ہو جائے اور انگریزی اسلوب اختیار کرے۔ دوسری یہ کہ شعرا عشقیہ مضامین باندھنا چھوڑ دیں اور زبان محض مناظرِ قدرت اور مضامینِ حقیقت ادا کرے۔ پہلی بات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہی کہ جس حد تک انگریزی تعلیم اور مغربی ہم آہنگی کا تعلق مغربیوں کے خیالات اخلاق و آداب سے ہی جو دو ہزار سال پُرانے ہیں اور بدلے نہیں جا سکتے اس حد تک اُن کا بہت زیادہ اثر نہ ہوگا اور اگر کوئی اس نئے انداز میں جیسے مولوی محمد حسین نے ایجاد کیا ہی، لکھے گا تو ہنسا جائے گا۔

"دوسری بات کے متعلق ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الحقیقت مولوی صاحب اُردو شاعروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ عشقیہ مضامین کے سوا انھوں نے کچھ اور نہیں لکھا یا وہ محض یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہندستان کے قدیم و جدید شعرا نے اس قسم کی سخن وری کی کہ شاعری میں عشق کا ایسا تناسب ہی جیسے کھانے میں نمک کا؟ میرا جواب یہ ہی کہ اُردو شاعری کا بڑا حصہ عشق سے بالکل غیر متعلق ہی اور ہر قسم اور ہر نوع اور ہر طرح کے مضامین بڑے خاص اور دل کش انداز سے ادا کیے گئے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ترقی وارتقا اسی چیز کے لیے ممکن ہیں جو ناقص یا خراب ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ عشق جس کے مسلسل تذکرے پر ہمیں ملامت کی جاتی ہے، شاعری کی جان ہے۔ اس کے بغیر اس میں کوئی لطف نہیں۔ عشق اظہار کے لیے ایک عجیب و دل کش شے ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا محبوب محبوبِ حقیقی ہے جیسا کہ حافظ، رومی، امیر خسرو، شمس تبریزی کی شاعری سے ظاہر ہے۔ اس طرح عشقیہ شاعری صفائے روح کا باعث اور نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ قاری کے ذہن کا کام ہے کہ وہ شاعر کا مطلب پالے۔ لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے کہ شاعری میں اُردو شاعروں کے پیشِ نظر ایک فرضی معشوق ہوتا ہے جس کا بجز ان کے تخیل کے اور کہیں وجود نہیں اور تعریف و توصیف سے ان کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے زورِ طبیعت اور زورِ قلم کی نمایش کریں۔

" قصہ مختصر، ہمارے نزدیک یہ تجویز کسی طرح مناسب نہیں بلکہ علم و فضل کے نقطۂ نظر سے مہمل ہے کہ اُردو شاعری کو انگریزی رنگ میں رنگا جائے اور ایک نیا اسلوبِ تحریر سوچا جائے۔ یہ چیز صرف اس وقت واقع ہو سکے گی جب انگریزی تعلیم ہمارے خیالات اور ہماری زبان، ہمارے آداب اور ہماری طرزِ معاشرت پر جو ہمارے خیالات کا منبع ہیں، ایسا اثر ڈالے کہ ہماری زبان بالکل بدل جائے۔"

ہندستان کے تمام مضمون نگار اس شدت سے مولوی محمد حسین کے مخالف نہیں اور میجر ہال رائڈ نے مشاعروں کے ذریعے اصلاح کی جو تجاویز پیش کی ہیں اُن سے انھیں کسی طرح اختلاف نہیں۔ اس

بحث پر امرت سر کے ایک مسلمان کے خیالات ملاحظہ ہوں[1]:-

"ہندستان میں مثل مشہور ہی کہ زوال کے زمانے میں تعلیم اور شاعری کی ترقی کی کوشش کی جاتی ہی اور واقعہ بھی یہی ہی۔ جب تعلیم اور فنونِ لطیفہ میں انحطاط ہوتا ہی تو لوگ فطرت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ باہمی تنازعات اور خانہ جنگیوں، خاص دشمنیوں اور عوام کے تعصب کے زمانے میں انسان ہر شی سے زیادہ مقاصدِ تخلیق کو جاننے کی کوشش کرتا ہی۔ یہی چیز زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری کی تاریخ اور ایران، مصر، یونان اور دنیا کے دوسرے ممالک کی تاریخ میں پائی جاتی ہی۔ ان کی نظم و نثر میں اس قدر قوت و طاقت ہی کہ ابھی تک باوجودے کہ علم و تعلیم کی اتنی صدیاں گزر چکی ہیں، کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ اقبال کے زمانے میں خیالات میں کم زوری پائی جاتی ہی یا قابل افراد کا فقدان رہتا ہی۔ میرا مقصد محض یہ ہی کہ تہذیب کی ترقی کے زمانوں میں معاشرتی کاروبار اس قدر بڑھ جاتا ہی کہ کسی شخص کے لیے یہ مشکل ہوتا ہی کہ وہ اپنے کو اس سے الگ کر کے اپنا قیمتی وقت سخن گوئی میں صرف کرے۔ آج ہمارا فرض یہ ہی کہ ہم اپنی شاعری سے اپنے قومی تعصبات اور خیال آرائی کو، جو غیر قدرتی محبت کو فروغ دیتی ہیں، خارج کریں اور ہمارا فرض ہی کہ اپنی شاعری کا خاص مقصد یہ قرار دیں کہ وہ ترقی اور عروج کی صداؤں پر لبیک کہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندستانیوں میں ہم دردی اور خلوص کی بنیاد پر یک جہتی

[1] پنجابی مورخہ ۹ مئی ۱۸۶۴ء

پیدا ہوگی۔ فصاحت و بلاغت اور سب سے بڑھ کر شاعری کی جادو کی سی تاثیر میں کچھ ایسی بات ہو جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہو کہ مشرقیوں نے اپنے آپ کو فطرت سے بہت ہی دور کر لیا ہو۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان میں ایسے شاعر موجود نہیں جنھوں نے مناظرِ قدرت کی نقاشی کی ہو۔ ان کی تعداد بہت کم ہو یہ سچ ہو۔ لیکن انھوں نے ایسے ایسے نقوش کھینچے ہیں جو ان کے مغربی بھائیوں کے کارناموں سے کم نہیں۔ وہ تعریف کے اور بھی زیادہ مستحق اس وجہ سے ہیں کہ مشرق میں آزادیِ خیال پر ہزاروں الزامات لگائے جاتے ہیں اور انھوں نے ان تمام مشکلات کا اپنے کردار اور عالی ہمتی سے مقابلہ کیا۔۔۔

"شاعری ہمیشہ زمانے کے مطابق ہوتی ہو۔ اگر زمانہ ہی پست خیال ہو تو شاعروں کے تخیل میں رفعت کیوں کر ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ دوسری سرزمینوں کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ واضح ہو کہ ہم اپنے پیش رووں کی پوری پیروی نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے پاس وہ مشعلیں نہیں تھیں جو اب ہمارے پاس ہیں۔ ہمارا فرض ہو کہ ہم تہذیب کے اعلا مدارج کے فیوض سے فائدہ اٹھائیں اور زمانۂ جدید جو سہولتیں بہم پہنچا رہا ہو انھیں کام میں لا کے اس طرح عمل کریں کہ آیندہ نسلیں ہماری اس طرح مشکور ہوں جیسے ہم گزرے ہوئے زمانوں کے مشکور ہیں اس لیے ہم مسرت کے ساتھ لاہور کے مشاعرۂ تہذیب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس طرح کے مشاعرے پابندی سے منعقد ہوتے رہیں گے۔"

پنجابی[1] میں یہ پڑھنے میں آتا ہو کہ ہم قوم اپنے جذبات و احساسات

---

[1] ۹ مئی ۱۸۷۴ء

کا شاعری کے ذریعے اظہار کرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری شاذونادر ہی عوام النّاس کے خیالات کا مظہر ہوتی ہے، نہ دیہاتیوں کے خیالات کی، نہ شہریوں کی، نہ جاہلوں کی اور نہ عالموں کی۔ شاعر کے خاص خاص خیالات کو وہ ادا کرتی ہے لیکن قوم کے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتی۔ شعرائے اُردو ان چیزوں کا بالکل ذکر نہیں کرتے جن سے یہاں کے باشندوں کو محبت ہے۔ وہ ان چیزوں کی تعریف یا مذمت کرتے ہیں جنھیں ہندستانی جانتے تک نہیں۔ اس قسم کی تحریروں کی اصلاح ضروری ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے بحث مباحثے کی ضرورت نہیں صرف مولوی محمد حسین کی تقریر پڑھنا کافی ہے[1]۔

"سب سے پہلے غزل کی اصلاح ضروری ہے جن کا مضمون ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور یہ خامی صرف اُردو میں جاگزیں نہیں بلکہ مشرق کی تمام اسلامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ یہ مشاعرہ جس کی ناظم صاحب تعلیمات نے بنیاد ڈالی ہے ہماری شاعری کی ترقی کی طرف رہ نمائی کرے گا اور اس طرح شاعروں کو سخن وری کا ایک اور بڑا میدان مل جائے گا اور وہ نئے نئے تشبیہات اور استعارات استعمال کر سکیں گے۔"

"انتظامِ نظمِ اُردو" کے عنوان سے پنجابی[2] کے ایک اور شمارے میں اسی بحث کے متعلق ایک اور مضمون میری نظر سے گزرا جس

---

[1] یہ تقریر اوپر نقل کی جا چکی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

[2] بابت ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء

کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:-

"تاریخ اور قصص کی کتابیں نظم و نثر کی تمام تصانیف جو ہمارے نصابوں میں مقرر کی گئی ہیں وہ ہمیشہ عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔ صرف مذہبی کتابیں اس سے مستثنا ہیں۔ ہم سررشتۂ تعلیم کے مشکور ہیں کہ اس کے ذریعے اب ہمیں بہت سی ایسی کتابیں حاصل ہوگئی ہیں جو ہمارے تمدن اور ہمارے حالاتِ حاضرہ کے لیے فائدہ مند ہیں لیکن افسوس کہ اب تک شاعری کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس میں یہ خوبیاں جن کی خواہش ہے، موجود ہوں۔ ہمیں توقع ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایسا کلام بھی حاصل ہو جاتے جو ہمارے موجودہ حالات اور اس ترقی کے موافق ہوگا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

"اُردو شاعری ایسا سامانِ تجارت ہو کے رہ گئی ہے جس کا کوئی خریدار نہیں یہی وجہ ہے کہ ایسے مشاعروں میں جن کا مقصد مسرت و تفریح ہوتی ہے یا ایسی مجالس میں جن کا مقصد ماتم وعزا ہوتا ہے شاعر خوشی یا رنج کی محض نمایش کرتا ہے...... اس لیے ہماری امید بھری نظر ان لوگوں کی طرف ہے جنھوں نے اُردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ لیکن اب تک اس موضوع پر کسی مجلس یا کسی اخبار میں باقاعدہ طور پر کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ صرف اُردو شاعری ہی کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اس طویل اور پُر جوش تقریر میں جو محمد حسین انجمنِ پنجاب کے ایک جلسے میں کی تھی، یہی نقص موجود ہے۔ وہ اس شاعری کی جو موجود ہے تعریف کرتے ہیں کہ کبھی کہ برج بھاشا کی تشبیہات و استعارات استعمال کیے

عربی اور فارسی کے صنائع ترک کر دیے جائیں۔ کبھی وہ انگریزی خیالات کے رواج پر زور دیتے ہیں کیوں کہ اُردو عربی، فارسی الفاظ اور برج بھاشا الفاظ کے ملاپ سے بنی ہی اور ہندو مسلم خیالات کا مجموعہ ہی، اس لیے ان کی رائے میں اب یہ ضروری ہی کہ انگریزی خیالات اور الفاظ بھی استعمال کیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین کو ترک کر دیا جاتے اور بہار و خزاں کا بالکل ذکر نہ کیا جاتے۔ بالآخر وہ شاعری کرنے کے لیے ایک نمونہ بھی پیش فرماتے ہیں اور آخر میں وہ خود بہار و خزاں کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے قلبِ محزوں کی آہ و بکا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور لیلیٰ مجنوں کا قصہ دُہراتے ہیں"۔

اس کے بعد مضمون نگار نے تفصیلات کو جانچا ہی اور خصوصیت سے محمد حسین کی بہت سی نظموں پر تنقید کی ہی۔

چند توجیہات کے بعد وہ کہتا ہی: "یہ امر یقینی ہی کہ اگر ہم اپنی شاعری کے موضوعات نہ بدلیں تو ہماری بحث کی سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم فراق اور وصال کے خاص مضامین ادا کرنے کے لیے نئی تشبیہات اور تازہ استعارات کہاں سے تلاش کریں گے۔ نظم و نثر کے لیے بالکل مختلف قسم اور نوع کے مضامین تلاش کرنے پڑیں گے۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ ہم بالکل جداگانہ زمین میں فصاحت و بلاغت کے بیج بوئیں۔

"یہ دریافت کرنا ہی کہ ہم موجودہ طرزِ تحریر کی خرابی کو کیوں کر دفع کر سکتے ہیں۔ اس کا ذریعہ وہی ہی جس کا اظہار کیا جا چکا ہی یعنی

انعامات واعزاز۔ رہ گئیں ممانعتیں وہ اس طرح کی ہونی چاہییں کہ شعرا بلا تکلیف وتامل انھیں قبول کرسکیں۔ ہماری سرزمین میں شاعری کا راستہ اس وجہ سے بالکل مسدود ہوگیا ہو کہ شاعری میں ہماری رسومات اور مذہبی باتوں کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ اس پورے رجحان کا بدلنا آسان نہیں۔ اگر مخربِ اخلاق مضامین ترک کردیے جائیں تو یہی بہت کافی ہو۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ اُردو شاعری کی تمام خرابیاں رفع ہوجائیں گی اور وہ بہت زیادہ دل کش ہوجائے گی"۔

علی گڑھ اخبار[1] کے ایک مضمون نگار کا خیال ہو کہ وہ وقت قریب ہو جب اُردو شاعری کی تکلیف دہ یکسانی اس ہمہ گوں طرزِ تحریر سے بدل جائے گی جس کی خواہش کی جاتی ہو اور جس طرح سنسکرت، عربی اور سب سے بڑھ کر انگریزی شاعری میں سب مضامین شاعری میں باندھے جاتے ہیں اُردو میں بھی یہی عمل ہوگا۔ یہ اس طرح ہوگا کہ لوگوں کو اس زبان کی دل کشی کا ثبوت حاصل ہوجائے گا۔ یہ مضمون نگار مولوی محمد حسین آزاد کی اس رائے سے متفق ہو کہ اُردو شاعری میں نئی زندگی کی تحریک کی روح پھونک دینی چاہیے۔ مضمون نگار کا خیال ہو کہ ان کے (مولوی محمد حسین کے) خیالات ان لوگوں کے دلوں پر بھی اثر کرچکے ہیں جو ان کی تجاویزِ اصلاح پر ہنستے تھے اور جن کو انھوں نے ایک مثنوی میں عمل کا جامہ پہنایا ہو۔ اس مضمون نگار نے لکھا ہو کہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مولوی صاحب مضامینِ تخیل کو متروک

[1] بابت ۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء

قرار دینا چاہتے ہیں یا حُسن کے متعلق نازک خیالیوں کو پسند نہیں کرتے یا اُردو شاعری کے استعارات و تشبیہات کو ناقص سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ قدرتی جذبات اور فطری مناظر کی طرف توجہ کی جائے۔ مضمون نگار کہتا ہے: "فصاحت و بلاغت میں امتیاز ضروری ہے"۔

اب انجمنِ پنجاب کے دوسرے مشاعرے کی کچھ تفصیلات سُنیے۔ یہ پہلے مشاعرے کے اصول پر منعقد کیا گیا تھا جو مولوی محمد حسین کی تقریر کی وجہ سے ممتاز تھا۔

طے شدہ تجویز کے مطابق ایک خاص مشاعرہ پہلے مشاعرے کے ایک ماہ بعد ۳۰ مئی کو منعقد ہوا۔[1] یہ مشاعرہ گزشتہ مشاعرے سے زیادہ بارونق تھا۔ بہت سی ممتاز شخصیتوں، ممتاز عہدہ دارانِ عدالت اور معزز رؤسا نے اس میں مدد دی ہے۔ عہدہ داران و ملازمینِ سرکار، کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا، پنجاب یونیورسٹی کے ممبر اور علم دوست حضرات نے شرکت کی۔

جب سب لوگ جمع ہو چکے تو لاہور کالج کے پروفیسر مولوی الطاف حسین المتخلص بہ حالی نے اپنی نظم پڑھی جس کا عنوان "برکھا رت"[2] تھا۔ اس کے بعد مولوی الطاف علی نے جو گورنمنٹ گزٹ کے اُردو مترجم ہیں، اسی موضوع پر ایک نظم "آب کرم"[3] پڑھی۔ اگرچہ ان دونوں نظموں کا

---

[1] یہ میں اخبار انجمنِ پنجاب مورخہ ۵ جون ۱۸۷۴ء سے نقل کر رہا ہوں۔

[2] اس مضمون پر ہندستان کے موجودہ شاعر جس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں، اگر کوئی ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے تو جرأت کی وہ نظم دیکھے جسے میں نے "تاریخ ادب ہندی و ہندستانی" جلد دوم صفحہ ۱۱۴ پر نقل کیا ہے۔ [3] اس نظم میں بارش سے مراد عنایتِ ربانی ہے۔

٣

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہیں اور طرفہ ماجرا یہ ہو کہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہو کہ سرما کی شدت سے شیطان کی سلطنت کا اندازہ ہوتا ہو"۔

حالی کی نظم 'برکھارت' کا ذکر پہلے آچکا ہو۔ اخبار پنجابی سالِ رواں کی ۴ جولائی کی اشاعت میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہو: "جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہو۔ جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اُٹھے اور کوئی صاحبِ ذوق اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہو کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہو کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حُسن و عشق کے چرچے کیے پھر بھی اس کی سادگی و رنگینی جادو کا کام کر گئی"۔

اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ (یکم اگست ۱۸۷۴ء) نے ساری نظم نقل کر کے اس کی خوب تعریف کی ہو۔ حالی کی ایک دوسری نظم 'نشاطِ امید' اور ذوق کا کوروی کی 'موسمِ بارش' کو ستمبر کے پرچے میں چھاپا ہو۔

مشاعرے کی چوتھی مجلس ۳ اگست کو منعقد ہوئی۔ حضرات شعرا کی تعداد اب کے اور بھی زیادہ تھی۔ کئی تو دُور دُور سے آئے تھے اور جو نہ آسکے انھوں نے اپنا کلام بھیج دیا تھا۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ ان سب کو دادِ سخن ملتی اور پھر کئی تو اسی پُرانی لکیر کو پیٹ رہے تھے جس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا گیا ہو۔ ان پامال مضامین

کو سننے کی تاب کسی میں نہ تھی۔ پنجابی (۲۸ اگست) نے ان شاعروں کی فہرست چھاپی ہے اور فرداً فرداً ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں سے بہت سوں کی روش نئی ہے اور کچھ ضمنی امور کو چھوڑ کر عموماً ان کی تعریف کی ہے۔ ان میں اخبار کو دہلی کے رئیس میرزا اشرف بیگ کی مثنوی 'نوبہارِ امید' سب سے زیادہ پسند آئی۔ اس میں ۲۸۰ بیت ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹر نے لکھا: "یہ ساری مثنوی اتنی مرصّع ہے کہ جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ طرزِ بیان میں صفائی اور جوش کا کمال نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سادگی کا یہ حال ہے کہ خاص و عام سب اس سے یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہر نکتہ ایسی اُستادی سے بیان کیا ہے کہ کسی بد ذوق کو بھی اسے سمجھنے میں دیر نہ لگے گی۔ بلند سے بلند خیال کو سادہ سے سادہ پیرائے میں ادا کیا ہے۔ اگر ایک طرف تصوّر و تخیّل میں خوب صورتی ہے تو دوسری طرف تشبیہ و استعارے میں توازن ہے۔"

مشاعرے کے آخر میں صاحبِ صدر نے اعلان کیا کہ اگلی مجلس میں 'حب الوطن' پر نظمیں پڑھی جائیں گی۔

یہ مجلس ۳ ستمبر کو لاہور میں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی بہت سے شاعر آئے اور جو نہ آ سکے ان کا کلام آیا۔ 'پنجابی' کے نقاد نے ۳ اکتوبر کے پرچے میں اس مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے۔ جو خود نہ آ سکے تھے ان میں سے دو کی اس نے خوب خبر لی ہے لیکن مولوی محمد شریف (ایڈیٹر طلسمِ حیرت مدراس) کی نظم کی جی کھول کر داد دی ہے۔ لکھا ہے کہ زبان و بیان کے حسن کا جہاں تک تعلق ہے وہ دہلی و لکھنؤ کے اُستادوں

کی صف میں بیٹھ سکتے ہیں۔

ان کے بعد نقادتین شاعروں کی بات بھی نہیں پوچھتا۔ البتہ جب حالی کی نظم 'حب الوطن' کا نام آتا ہے تو وہ بتلاتا ہے کہ لوگوں نے ہمہ تن گوش اسے سنا اور یہ بھول گئے کہ رات بیت چکی ہے۔ سب پر اس کا اثر ہوا۔

جنھوں نے اپنا کلام پڑھ کر سنایا ان میں مولوی محمد حسین آزاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اخبار نویس کا بیان ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز جاذبِ توجہ تھا لیکن نفسِ مضمون کو دیکھ کر اصلاح پسندوں کو نا امیدی ہوئی۔ وہی گل و بلبل کے چونچلے، وہی مے و مینا کے چرچے۔ جنھیں شاعر سے بڑی بڑی توقعات تھیں، وہ سخت مایوس ہوئے۔ اس نظم کا عنوان 'صبح امید' ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تنقید کی آنچ پر وہ کھری نہیں اترتی۔ استاد ذوق کے شاگردوں میں آزاد کو امتیاز حاصل ہے۔ اس کے باوجود وہ اس مرتبے کا مستحق نہیں جو جدید شاعری کے حامیوں نے اسے عطا کیا ہے۔

انجمن کے اگلے مشاعرے کا موضوعِ سخن 'انصاف' قرار پایا۔ یہ مجلس ۱۴ نومبر کو ہوئی۔ میجر ہول رایڈ اور متعدد ہندستانی اہلِ قلم اس میں شریک تھے۔ شاعروں میں میرزا محمد اکبر خاں خاور بھی تھے جنھیں سلطان الشعرا کا خطاب ملا ہے۔ 'پنجابی' (دسمبر) کی رائے ہے کہ نظموں کا معیار عموماً سطحی تھا اور آزاد کا کلام تو پہلے سے بھی زیادہ گر گیا۔ البتہ حالی کی نظم حسبِ دستور حاصلِ مشاعرہ تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انھی کے دم سے ان مجلسوں کی رونق ہے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نئے قسم کے مشاعرے صرف لاہور کے لیے مخصوص ہیں۔ لکھنؤ میں بھی اسی غرض سے ایک انجمن بنی ہے جس کے نگراں مظفر علی اسیر ہیں۔ اودھ اخبار کے حوالے سے 'پنجابی' لکھتا ہے کہ ۱۲ ستمبر کو اس کی طرف سے ایک مشاعرہ ہوا جس میں کئی مشہور شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ کئی انگریز بھی تھے جن میں ناظم سررشتۂ تعلیم کا نام قابلِ ذکر ہے۔

اس مشاعرے میں غزلیں پڑھی گئیں لیکن وہ سب نئے انداز کی تھیں اور مختلف مضامین کی حامل تھیں۔ انھیں سن کر سامعین دنگ رہ گئے۔ یہ جدت ان میں سے بہتوں کی سمجھ میں نہ آئی لیکن زبان اور محاورے کی خوبیوں نے انھیں بھی پرچا لیا۔ تنگیِ وقت کی وجہ سے کئی شاعروں کو اپنی بیاضیں کھولنے کا بھی موقع نہ ملا۔ مگر ان سب کا کلام ان کے مختصر حالات کے ساتھ ایک 'گل دستہ' کی شکل میں شایع کیا جائے گا۔ ان کی دوسری غزلیں بھی اس میں شامل کی جائیں گی۔ یوں سمجھیے کہ یہ گل دستہ ہم عصر شعرا کا چھوٹا سا 'تذکرہ' ہوگا۔

یہ بیان طول کھینچ رہا ہے لیکن میں اسے اس مضمون کا اقتباس دیے بغیر ختم نہیں کر سکتا جو "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے" کے عنوان سے ۱۰ اکتوبر کے 'پنجابی' میں چھپا ہے۔ مضمون نگار شکوہ سنج ہے کہ شاعروں کو وہ انعام دیر سے ملتے ہیں جن کا وعدہ نئے قسم کے مشاعرے کے انعقاد کے وقت ہوا تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ ایک کمیٹی ان نظموں کو جانچے اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرے لیکن

اب تک اس کمیٹی کے تقرر کی نوبت نہ آئی۔ امید ہے کہ کمیٹی میں صرف ایسے لوگ ہوں گے جو صاحب زبان اور صاحب ذوق ہونے کے ساتھ نئی شاعری کے حامی اور غیر جانب دار بھی ہوں مضمون نگار کی ایک شکایت یہ بھی ہے کہ پنجاب کا سررشتۂ تعلیم مطبوعات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور دو چار کو چھوڑ کر باقی مصنفین کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ مشکل سے ان کی کتابوں کے دس بیس نسخے خریدے جاتے ہیں اور ان بے چاروں کو کتاب کی لاگت بھی وصول نہیں ہوتی۔ اس غیر مطمئن مصنف کا خیال ہے کہ صوبۂ اودھ کا محکمۂ تعلیم اتنا سرد مہر نہیں۔ دونوں صوبوں میں وہ زمین و آسمان کا فرق پاتا ہے۔ اودھ میں تقریباً ۶۶ کتابوں پر انعام مل چکا ہے اور ان کے دو دو یا تین تین سو نسخے خریدے جا چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے اودھ میں ضرورت ہوتے ہی اچھے سے اچھے مصنف اور مترجم مل جاتے ہیں۔ مضمون نگار اس صورتِ حال کے لیے پنجاب کے ناظمِ تعلیم کو ذمے دار قرار نہیں دیتا کیوں کہ ان کی نکتہ رسی عدیم المثال ہے لیکن ان کے ماتحت یہ ساری گڑبڑ مچاتے ہیں۔ وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ کتب بینی کا شوق کسی کو نہیں اور حکومت جو کتابیں خریدتی ہے وہ دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ کتابیں طلبا میں کیوں نہیں بانٹ دی جائیں، ان کے لیے تو یہ نہایت مفید ہوں گی۔ عہدِ گزشتہ میں ہندو راجا یا مسلمان بادشاہ کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ صدیوں کے بعد بھی وہ باقی ہیں اور یورپ کے عالم بھی انھیں شوق

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آسان اور مناسب ہے۔

سرکاری ملازموں کو انگریزی لکھنے کا ایسا شوق ہے کہ دفتر کا سارا کام اسی زبان میں کرتے ہیں لیکن جب وہ رومن خط میں اپنا نام لکھتے ہیں تو اسے کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ چناں چہ حکومتِ بنگال نے حکم دیا ہے کہ اہلِ ملک انگریزی کے ساتھ اپنی زبان کے رسم الخط میں بھی نام لکھا کریں[1]

ہندستانی غالباً سب سے زیادہ متموّل زبان ہے کیوں کہ وہ عربی فارسی اور سنسکرت سے براہِ راست الفاظ مستعار لے سکتی ہے۔ اور کسی زبان میں اتنے ہم معنی الفاظ نہ ہوں گے۔ علاوہ برایں دوسری زبانوں کی طرح اس میں ملے جلے الفاظ کی بھی بہتات ہے جن کے مطالب میں نازک سا فرق ہوتا ہے۔ ان کی لغت تیار کرنے کا بیڑا W mes W. Farrell نے اٹھایا ہے یعنی وہ وہی کام کرنا چاہتے ہیں جو Girard اور Beauzee نے فرانسیسی اور آرک بشپ Whatley نے انگریزی میں انجام دیا۔ انھوں نے ایسے الفاظ کی فہرست تیار کی جن کا استعمال عام ہے اور جن کے ہم معنی الفاظ کئی کئی ہیں اور پھر ان کے فرق کو نہایت احتیاط سے سمجھایا ہے۔ ناظر کی آسانی کے لیے حروفِ تہجّی کے لحاظ سے ایک اشاریہ بھی مرتب کر دیا ہے۔ یہ نقص ضرور رہ گیا کہ الفاظ کو اردو رسم الخط میں بھی نہیں چھاپا گیا۔ جب کتاب کلکتہ میں شایع ہو رہی تھی تو اس میں دقّت ہی کیا تھی۔

---

[1] علی گڑھ اخبار ۶ مارچ سنہ ۷۲ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

([illegible]) [illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کی کتابیں ہندی میں منتقل ہوتیں اور اس ملک کے باشندوں کی حالت اتنی ابتر نہ ہوتی جیسی آج نظر آتی ہے۔

ہندستانیوں کا طرزِ تعلیم یورپ سے مختلف ہے۔ مثلاً جغرافیہ کی اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے کیوں کہ نہ تو ہم تجارت کرتے ہیں۔ اور نہ سفر کرتے ہیں اور اس لیے اس شعبۂ علم کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ تاریخ ایک ایسا علم ہے جو ہمیں اپنے اجداد کے عروج و زوال کے اسباب سمجھاتا ہے اور نیک و بد میں تمیز سکھاتا ہے لیکن اہلِ وطن نے اسے بھی طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا ہے اور یا اسے دل بہلانے کے لیے افسانوں کا کوئی مجموعہ تصور کرتے ہیں۔

ہم ترقی کی جس راہ پر چلنا چاہتے ہیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر شعبے کے لیے الگ الگ کمیٹیاں بنائی جائیں جو سائنس اور جملہ علوم کی کتابوں کے ترجمے کریں۔ علم دوست امرا اور ہندستان کے جملہ بہی خواہوں کو اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اس طرح پانچ سال کے اندر ہماری حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی تو ہمارا ذمہ۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ حکومتِ وقت مترجموں اور مؤلفوں کی مناسب حوصلہ افزائی کرے۔"

مہاراجا کشمیر کو اس اخبار نویس کی رائے سے اتفاق ہے چنانچہ انھوں نے دو سال پہلے جموں میں انگریزی سے ہندی اور اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔

علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی ایک ایک کر کے آرٹ اور سائنس کی ان ۲۳۰ کتابوں کو اردو میں منتقل کرا رہی ہے جنھیں علمائے فرنگ

نے یہ کہہ کر منتخب کیا ہے کہ وہ اہلِ ہند کی ذہنی تربیت کے لیے موزوں ترین ہیں۔ سوسائٹی نے ابھی حال ہی میں مالکم کی 'تاریخِ ایران' کا ترجمہ اُردو میں شایع کیا ہے۔

مسٹر کولن براؤننگ نے ۱۸۷۳ء میں صوبۂ اودھ کی تعلیمی حالت کے متعلق ایک رپوٹ چھاپی ہے۔ اس میں نئی مطبوعات کی جو فہرست ہے اس میں دو ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو پنڈت شیو نارائن کا کیا ہوا 'جغرافیۂ اودھ' کا ہندی ترجمہ، 'تاریخ فرشتہ' کا اُردو ترجمہ قریب قریب تیار ہو چکا ہے۔

منشی ذکاءُ اللہ نے جو میور کالج الہ آباد میں پروفیسر ہیں، تاریخِ ہندستان کے نام سے اُردو میں ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کے شروع میں ملک کا جغرافیہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسے الفنسٹن 'بل'، مارش مین وغیرہ کی مستند تاریخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے[1]۔

ملکی اخباروں نے سب سے زیادہ جس کتاب کی تعریف کی ہے اس کا نام افسانۂ حمید ہے۔ یہ سیّد غلام حسید خاں شکیم پوری کی تصنیف ہے۔ موصوف ہندستان کے ممتاز ادیبوں میں ہیں۔ بدنصیبی سے کتاب کی طباعت بہت بُری ہوئی ہے۔ اور علی گڑھ اخبار میں رجب علی سرور نے خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کا ایک اچھا ایڈیشن چھاپا جائے۔ انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ کتاب حکومت کی طرف سے شایع کی جائے اور اس کے نسخے سارے ملک میں تقسیم کیے جائیں۔ جہاں تک کتاب کے مضمون کا تعلق ہے وہ اس کی خوبیوں کے قائل ہیں۔ حمید کی داستان آج سے آٹھ نو سو سال پہلے شروع ہوتی ہے اور

---

[1] علی گڑھ اخبار ۲۰ مارچ ۱۸۷۴ء اور اخبار انجمن پنجاب ۱۷ اپریل ۱۸۷۴ء

مصنف نے اس زمانے کے حالات نہایت دل چسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ اس میں مبالغہ یا تخیل سے کام نہیں لیا گیا۔ اندازِ تحریر پُرجوش اور مُقفا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں بھی سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف نے عربوں اور ایرانیوں کی دلیری کا تذکرہ کیا ہے لیکن اپنے ملک کو وہ مشرق کا سرتاج سمجھتا ہے۔ ہندستانی عورتوں کی عصمت و عفت کا وہ خاص طور پر دل دادہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی وفا شعاری جس کا تقاضا تھا کہ چتا پر جل کر ستی ہو جائیں، دنیا میں بے مثل ہے۔ مصنف ستی کی رسم اور بیوہ کی شادی کی ممانعت کا مخالف ہے اور حیرت سے پوچھتا ہے کہ رنڈوے کے لیے جو جائز ہے وہ رانڈ کے لیے کیوں ناجائز ہے۔ وہ بچپن کی شادی کو بھی ناپسند کرتا ہے اور اسے بہت سی برائیوں کی وجہ سمجھتا ہے[1]۔

اسے پڑھ کر مجھے ایک دوسری کتاب یاد آتی جس میں ہندستان کی عورتوں کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کا نام 'مجلس النسا' ہے اور اس میں ایک اُستانی، ایک لڑکی اور اس کی ماں کے مکالمے کے پیرائے میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مولوی الطاف حسین حالی کی تصنیف ہے جن کے علم اور فصیح البیانی کا ہر طرف چرچا ہے[2] اور جن کی نظمیں انجمنِ لاہور کے مشاعرے میں جان ڈال دیتی ہیں[3]۔ پادری عماد الدین کی کتابوں

---

[1] علی گڑھ اخبار بابت نومبر ۱۸۷۳ء

[2] 'پنجابی' بابت ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء

[3] ان میں سے ایک پوری نظم اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ بابت اگست ۱۸۷۴ء میں شایع ہوئی ہے۔

"تاریخ محمد[ی]" اور "تحقیق الایمان" کا رد بھی حالی نے لکھا جس کا نام "تریاق مسموم" ہے۔

سر ڈبلو میور Sir W. Muir جو گورنر جنرلِ ہند کی کونسل کے رُکن مقرر ہوتے ہیں، علاج کی غرض سے یورپ آتے ہوئے تھے۔ پیرس سے گزرتے وقت وہ مجھ سے ملنے آئے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ موصوف نے سالِ رواں میں عمدہ کتابوں کے مصنفوں کی ہمت افزائی کے لیے پانچ ہزار رُپے کی رقم عنایت کی ہے۔ ان میں سے سولہ اُردو کے اور دو ہندی کے لکھنے والے ہیں۔ ان میں جو کتاب مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ مولوی نذیر احمد کی 'توبتہ النصوح' ہے۔ مولوی صاحب اس قسم کی دو اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔ کہنے کی بات ہے کہ انھوں نے خیال آفرینی اور انشا طرازی کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کی گھریلو زندگی کو خوب سلجھا کر بیان کیا ہے۔ لیکن کتاب کا اصل حسن رواداری اور خوش اخلاقی کی تلقین میں مضمر ہے۔ کتاب کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ سچی خوشی مذہب کی پابندی ہی میں ملتی ہے۔

کئی اور کتابیں بھی دل چسپی سے خالی۔ مرادآباد کے انسپکٹر آف اسکول متولال نے 'مفید الدہر' کے نام سے ایک اخلاقی نظم تصنیف کی ہے۔ یہ صاحب 'صفا' تخلص کرتے ہیں اور کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ علاوہ بریں حسبِ ذیل کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں:۔

'تذکرۂ بلاغت' از مولوی ذوالفقار علی انسپکٹر آف اسکول سہارن پور

'تاریخ کالپی' از شیخ حیدر بخش

"مراۃ الملک" (تاریخ حکومت انگریزی) از رحیم بخش دہلوی۔
"تاریخ المعانی۔ از میرزا محمود بیگ ساکن پٹیالہ۔

ملکی اخباروں نے علی گڑھ کالج کے محمد سعید کی کتاب "سیر المتقدمین" کا اشتہار دیا ہے۔ دراصل یہ Lenwnarks of History کا ترجمہ ہے۔

"رہنمائے دہلی" کا موضوع اس کے نام سے ہی ظاہر ہے اسے انجمنِ پنجاب نے ٹائپ میں چھاپا ہے۔

"آداب الطلاب" ترجمہ ہے نصیر الدین طوسی کی کتاب "آداب المتعلمین" کا۔ ترجمہ مولوی سید احمد حسن نے کیا ہے جن کا کلام اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔

اخبار سررشتہ تعلیم اودھ اور اخبار انجمنِ پنجاب نے سورج بنسی اور چندر بنسی گھرانوں پر لالہ ہزاری لال کی ایک مثنوی چھاپی ہے۔ شاعر نے ۱۰۱ اشعار میں ان گھرانوں کی تاریخ بیان کی ہے اور اس سے صرف ہندستانی ہی نہیں بلکہ زبان جاننے والے یورپین بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

"طبِ رحیم" کے نام سے ڈاکٹر رحیم خاں نے اردو میں ۳۴۵ صفحات کا ایک مقالہ لکھا ہے جو لاہور کے میڈیکل کالج کے نصاب میں داخل ہو گیا ہے۔ اس میں تمام بیماریوں کے اسباب تشخیص اور علاج پر بحث کی گئی ہے۔ بیماریوں کے نام صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ یونانی، عربی اور انگریزی میں بھی دیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ کسی نکتے کو سمجھانے کے لیے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے

میں علم الطب پر سائنٹفک بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں بیماریوں کا بیان ہے۔ البتہ سرجری یا علمِ تشریح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ 'پنجابی' کے ریویو نگار کا بیان ہے کہ ان دو مضمونوں پر الگ رسالے موجود ہیں[1]۔

گنگا پرشاد مرادآبادی نے 'کتاب نباتاتِ ہند' میں جڑی بوٹیوں کا حال لکھا ہے۔ اس کے لکھنے میں پرانی کتابوں سے خاصی مدد لی ہے اور بوٹیوں کے طبی فوائد بیان کیے ہیں۔

مسٹر فیلن Mr Fallon اپنی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائے گی تو ہندستانی زبان کے شائقین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو گی۔ تحریری اور بول چال۔ دونوں بولیوں کے الفاظ کے مجموعے کے علاوہ اس میں محاورے بھی جمع کیے جائیں گے اور ان کا برمحل استعمال مثال دے کر سمجھایا جائے گا۔ ہر لفظ کے ماخذ کی تشریح ہو گی۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہوگا جو ایک بلند پایہ لغت میں ہونا چاہیے۔ یہی نہیں کہاوتیں اور پہیلیاں بھی شامل کی جائیں گی مسٹر فیلن نے اپنے کارنامے کا ایک نیا خاکہ شایع کیا ہے جو علمی دنیا کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ لغت کی طباعت کا انتظام پٹنہ میں کیا گیا ہے اور وہ کئی حصوں میں شایع ہو گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی پتّا ماری کا کام ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے دولت اور محنت دونوں درکار ہیں۔ ایسی ضخیم لغت کی طباعت کے لیے زرِ کثیر کی ضرورت ہوگی۔ بہر حال میری دعا ہے کہ یہ کارنمایاں جلد از جلد

لہ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء

خیر و خوبی سے انجام پاتے۔

یورپینوں کی لکھی ہوئی اُردو زبان کی گریمریں تو کئی ہیں۔ اس اہم صیغے کی طرف خود ہندستانیوں نے کوئی توجہ نہ کی تھی۔ لیکن وقت کا تقاضا ایسا ہوتا ہی کہ اب وہ انگریزی میں گرامر لکھنے لگے ہیں۔ چناں چہ کیننگ کالج کے پروفیسر رام کشن نے لکھنؤ سے Hand book of Urdu Grammer (اُردو صرف و نحو) انگریزی میں شایع کی ہی۔ یہ کلکتہ یونی ورسٹی کے ممتحنوں کی آسانی کے لیے لکھی گئی ہی۔ اسے نئے اصولوں پر مرتب کیا گیا ہی اور سرورق پر عربی کی یہ ضرب المثل درج ہی: کل جدید لذیذ میور گزٹ پر بھی یہی مقولہ تحریر ہی۔

اخبار سررشتہ تعلیم اودھ[1] نے ان کتابوں کی فہرست چھاپی ہی جو لکھنؤ سے سالِ رواں کے نو مہینوں میں شایع ہوئی ہیں۔ ان میں حسبِ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:-

ذخیرۂ نجات } از لال جی
رموز العارفین }

فسانۂ غم آموز از حافظ امیر الدین

گلشنِ فیض (تاریخ راجا بھوج) از نند کشور لال

دیوان واسطی جبل پوری

کلام سداسکھ عاشق

---

[1] دراصل یہ ماہانہ رسالہ ہی جو ہر پہلی تاریخ کو لکھنؤ سے شایع ہوتا ہی۔ ہر پرچے میں تین کالم کے ۳۲ صفحے ہوتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(grows broad) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رؤے سخن کتاب میں پیغمبرِ اسلام کی جانب ہی۔ میرزا فتح محمد بیگ[1] نے اس رسالے پر ایک محققانہ تبصرہ شایع کیا ہی۔ مولوی صاحب موصوف نے عیسائی مبلغوں کے ادھ کچرے علم کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور حیرت ظاہر کی ہی کہ رام چندر جیسے ذی علم مصنف نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ بعد ازاں میرزا صاحب نے اس عیسائی عالم کے استدلال کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہی۔ رام چندر صاحب کا دعوا ہی کہ قرآن و حدیث کے مطابق عیسائی اصل ایمان والے ہیں نہ کہ مسلمان۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ انجیل اور قرآن دونوں کے مطابق آں حضرت صلعم (نعوذ باللہ) دجال ہیں۔ پھر میرزا صاحب نے ثابت کیا ہی کہ رام چندر کا یہ دعوا کہ قرآن شریف اور انجیل میں مطابقت پائی جاتی ہی، بے بنیاد ہی۔ میرزا صاحب نے رام چندر کے دعووں کا جواب بڑی معقولیت سے دیا ہی اور مثالیں دے دے کر ثابت کیا ہی کہ انجیل کے دونوں حصوں میں متاخرین نے کتنا تصرف کر دیا ہی۔

مولوی محمد علی نے لالہ اندرمن کی تصنیف 'صولتِ ہند' کے جواب میں 'ظفر مبین' کے نام سے چھ سو صفحوں کی ایک ضخیم کتاب شایع کی ہی۔ مدیرِ پنجابی[2] کا بیان ہی کہ اس میں ہندستان کے مذاہب پر نہایت مدلل اور معقول بحث کی گئی ہی۔

مسٹر F. S. Growse (ایف۔ ایس گروس) نے

[1] پنجابی بابت یکم جنوری اور ۲۷ فروری ۱۸۷۴ء
[2] پنجابی بابت ۲۱ فروری ۱۸۷۳ء

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ (شمارہ ۴ - سنہ ۱۸۷۴ء) میں چند
کی تصنیف 'پرتھوی راج راسو' کے ابتدائی اشعار کا ترجمہ نظم میں شایع
کیا ہے اور ضروری حواشی بھی دیے ہیں۔ ریورنڈ A. F. Rudolf
Hoernle نے جَوگوڑی زبانوں کی تقابلی گرامر لکھ کر شہرت حاصل
کر چکے ہیں۔ اسی عظیم الشان رزمیہ نظم کے ۲۷ویں باب کا ترجمہ
Indian Antiquary کے جنوری سنہ ۱۸۷۴ء نمبر میں
شایع کیا ہے۔ اپریل کے شمارے میں انھوں نے نظم کی بحروں پر
ایک عالمانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر
John Beames کے تعاون سے موصوف 'راسو' کو بالاقساط
شایع کر رہے ہیں۔ جون صاحب نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے
رسالے میں چند بردائی کی صرف و نحو پر ایک بصیرت افروز مقالہ
لکھا ہے۔ Indian Antiquary (جنوری سنہ ۷۴ء) میں
ان کا دوسرا مضمون 'ہندی میں اضافت کے استعمال' پر چھپا ہے۔
ہندستانی رسائل و جرائد میں اس سال جن شاعروں کو مقبولیت
حاصل ہوئی، ان کے نام نیچے درج کرتا ہوں:-

میرزا اشرف بیگ خاں دہلوی۔ اشرف
جواہر سنگ بلرام پوری - جوہر
کفایت علی بلندشہری۔ کفایت
محمد عمر علی وحشی
لکھپت رائے ببتر
محمد حسین (راہووالیہ) محمود

سیف الحق دہلوی۔ ادیب
غلام محمد خاں۔ غلامی
غلام اصغر سیال کوٹی۔ شیدا
کشن گوپال وزیر آبادی۔ شیدا

حضرات شعرا کے تذکرے میں سابق شاہ اودھ واجد علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اختر تخلص فرماتے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں کلکتہ سے تین میل دور دریاے ہگلی کے کنارے کوئی بیس سال سے قیام پزیر ہیں۔ دو لاکھ بیس ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہی۔ موسیقی، مصوّری اور شاعری سے شغف ہی۔ ان کے بنائے ہوئے گیت کلکتہ اور بنارس کے گھروں اور بازاروں میں گائے جاتے ہیں۔ انھیں 'حضرت کی طغری' کہتے ہیں[1] وہ جس شاہی محل میں رہتے ہیں اسے ان کی عمل داری کہنا چاہیے۔ ان کی رعایا کی تعداد چھ ہزار ہی اور دربار داری کی وہ ساری شان باقی ہی جو لکھنؤ کی زینت تھی۔ وہ اپنے محل سے کبھی باہر قدم نہیں رکھتے۔ خود وائس رائے سے ملنے نہیں جاتے، البتہ وہ ان سے ملنے آیا کرتا ہی۔ اپنی رہایش کے لیے بادشاہ نے تین محل بنائے ہیں: سلطان خانہ جسے شاہی محل کہنا چاہیے، آزاد منزل اور زرد کوٹھی۔ حرم میں دو بیگمیں ہیں اور ایک سو اکتیس خواصیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کی سب سے

[1] اس پر حاشیے میں گارساں دتاسی نے لکھا ہی: "واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ "زیب طغرا" بھی لکھا جاتا ہی۔ اسلامی بادشاہوں کے اسلحہ پر طغرا، میں نام لکھا جاتا تھا۔ طغرا سے صفت ہی طغری"۔

عجیب چیز اس کا چڑیا گھر ہی جو سارے عالَم میں انتخاب ہی۔ اس میں سب ملا کر بیس ہزار جانور ہیں جن میں سے کئی نایاب ہیں۔ کبوتروں کا ایسا انتخاب کہیں نہ ہوگا۔ سانپوں اور رینگنے والے دوسرے جانوروں کی اتنی قسمیں کہیں دیکھنے میں نہ آئیں گی۔ باغات کی آرایش نظر افروز ہی اور ان کی دیکھ بھال تین سو مالیوں کے سپرد ہی[1]

"اودھ اخبار" اور اس کے بعد "اخبارِ عالم" میرٹھ[2] میں نواب احمد حسن خاں جوشؔ عرف اچھے صاحب کی مثنوی منشی میاں وادخاں کی مدح میں شایع ہوئی ہی جس میں صنعتِ توشیح کی رعایت رکھی ہی۔

"اُردو کا خون" کے عنوان سے بابو شیو پرشاد نے کلکتہ یونی ورسٹی کے نصاب کے لیے ایک انتخاب شایع کیا ہی۔ اس میں شکنتلا کی کہانی، افسوس کی آرایش محفل کے اقتباس اور گنج خوبی مترجمہ اخلاق محسنی کے اقتباس شامل ہیں۔ نجم الاخبار اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ[3] میں اس انتخاب پر سخت لعن طعن کی گئی ہی۔ خصوصاً شکنتلا اور آرایشِ محفل پر یہ کہ کر اعتراض کیا گیا ہی کہ ان کی زبان غیر فصیح ہی اور بڑی حد تک متروک ہو چکی ہی۔ اس سلسلے میں وہ بال کی کھال نکالی گئی ہی کہ توبہ۔ اور سخت تعجب ہی کہ آرایشِ محفل تک کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا گیا حالاں کہ

[1] لندن ٹائمس ۲۷ و ۳۰ اکتوبر ۱۸۷۴ء

[2] پرچہ بابت ۲ اپریل ۱۸۷۴ء

[3] ۳ اپریل ۱۸۷۴ء

[illegible]

کا ذکر کیا ہو۔ لکھا ہو کہ رئیسوں، شاعروں اور خطیبوں کی ایسی ریل پیل، ناچ رنگ کی یہ دھوم دھام اور ندی پر چراغاں کا یہ ٹھاٹ اور کہیں دیکھنے میں نہ آئے گا۔ یہ میلا اس لیے لگتا ہو کہ حضرت محمد کے نقشِ قدم کی زیارت کی جاتی۔ کہتے ہیں کہ ایک پتھر پر قدمِ مبارک کا نقش موجود ہو۔

کٹر مسلمانوں کو ناٹک ناپسند ہیں۔ چناں چہ بوہروں کے بڑے پیر نے فتوا صادر کیا ہو کہ ان کا کوئی پیرو ناٹک دیکھنے نہ جائے۔ بمبئی میں بوہروں کی تعداد اچھی خاصی ہو۔ اس فتوے پر تھیٹر کے مالک سخت برہم ہیں[۱]

فحش کتابوں کی اشاعت پر حکومت کا احتساب سخت تر ہوتا جاتا ہو اور انھیں پڑھنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ کہیں سے مانگ تانگ کر چوری چھپے پڑھا جائے۔ پنجاب کے پنڈت کرشن لال نے گزشتہ فروری میں اس مسئلے پر تقریر کی اور واضح کیا کہ یہ احتساب کس حد تک جائز تصور کیا جا سکتا ہو۔ 'مقیاسِ فحش' کے نام سے پنڈت جی نے اسی مضمون پر ایک مبسوط مقالہ بھی سپردِ قلم کیا ہو[۲]۔ اخباروں نے ان کی رواداری اور معقولیت پسندی کو بہت سراہا ہو۔ ان کا بیان ہو کہ پنڈت جی بہت بڑے عالم ہیں اور بہ یک وقت ہندی، اُردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے ماہر ہیں۔ وہ شعر

---

[۱] انڈین میل ۲۷ جولائی ۱۸۷۰ء

[۲] اخبار انجمن پنجاب۔ بابت ۲ فروری۔ بعد ازاں اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ نے بھی اسے نقل کیا ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اب کتب فروشوں کو یہ ہول ہو کہ کہیں دوسری کتابیں بھی اسی زُمرے میں شمار نہ ہوں۔ کیوں کہ ایسا کوئی قانون نہیں ہو جس سے فحش و غیر فحش کی تمیز ہو سکے۔ بہتیرے یورپیوں کا تو یہ گمان ہو کہ ہر ایشیائی کتب فحش ہو۔ اس صورت میں تو جنتری اور بغدادی قاعدے تک پر اعتراض ہو سکتا ہو۔ ایک کتب فروش تو اتنا سہم گیا تھا کہ پنڈت جی سے کہنے لگا کہ اگر اس جُرم میں اور کسی کا گلا ناپا گیا تو میں یہ دُکان بیچ کر ہمیشہ کے لیے کتابوں کے نام سے توبہ کرلوں گا۔ یہ سب دیکھ سُن کر پنڈت جی سنّاٹے میں آگئے اور انھوں نے وہ معرکۃ الآرا مقالہ تیار کیا جس کا خلاصہ اخبار 'پنجابی' (۲۱ فروری ۱۸۷۴ء) کے حوالے سے میں نیچے درج کرتا ہوں :۔

"انسان اور حیوان میں اصل فرق زبان کا ہو۔ زبان کے وسیلے سے انسان اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتا ہو۔ اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یا تو کوئی فحش مضمون برہنہ ہو سکتا ہو یا نیم برہنہ یا پوشیدہ اور یا شایستہ۔ اس لحاظ سے اسلوبِ بیان کی چار الگ الگ قسمیں ہیں۔ (۱) وہ جس میں کوئی مذموم مضمون انتہائی برہنگی سے بیان کیا جائے۔ (۲) وہ جس میں صنائع و بدائع سے اس کا سَتر کیا جائے۔ (۳) وہ جو آزادی میں حسن کا پہلو باقی رکھے۔ (۴) وہ جس میں بات بڑی تراش اور سنوار کے ساتھ کہی جائے۔

پہلا طریقہ سرائے، بھنگڑی خانہ اور چکلہ گھر میں چلن پاچکا ہو

[illegible]

[illegible]

اور جس کے ترجمے تمام زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

عربی کا پایہ سنسکرت سے کم بلند نہیں۔ لیکن 'ناٹک' کے قسم کی چیز جو حسنِ ذوق پر دلالت کرتی ہو، عربی میں نایاب ہو[1]۔

فارسی میں بیان کے سبھی پیرایے ملیں گے۔ خاقانی اور انوری نے فحش بیانی کی ہو لیکن ایسی ہوشیاری سے کہ ناظر کے ذوق پر گراں نہیں گزرتی۔

پیرایۂ مستور میں تو فارسی نے ایسی نُدرت دکھلائی ہو کہ اور کہیں جواب نہیں ملتا۔ اور حقیقت تو یہ ہو کہ فارسی کے ہر انشا پرداز کے ہاں اس کی مثالیں ملیں گی۔ اس ضمن میں بہارِ دانش خاص طور پر بدنام ہو۔ 'گلستاں'، تک جس کا وِرد بچّہ بچّہ کرتا ہو، اس عیب سے خالی نہیں۔ اس میں ایسے جملوں اور محاوروں کی کمی نہیں، جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں[2]۔

سنسکرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہو اس کا اطلاق ہندی بھاشا پر بھی ہو سکتا ہو۔

رہ گئی اُردو، تو اس پر فارسی کا گہرا اثر ہو اور اسی کی طرح اس نے پردے پردے میں سب کچھ کہہ جانے کا خوب سلیقہ پیدا کر لیا ہو۔ لیکن بُرقع اُتار کر اوڑھنی ڈال لینے سے عورت کا حُلیہ جتنا بدل جاتا ہو اتنا ہی فرق 'ریختہ' اور 'ریختی' میں ہو۔ جعفر زٹلّی، چرکین اور جان صاحب

---

[1] پنجابی کے ایڈیٹر نے بجا طور پر اس بیان کی تردید کی ہو۔

[2] مکتبوں میں پڑھائی جانے والی فارسی کتابوں میں بھی ایسی باتیں آجاتی ہیں جن کی گرفت کی جاسکتی ہو۔ یوسف زلیخا، بہارِ دانش وغیرہ ملاحظہ ہوں۔

کی تنگ بندی علانیہ فحش نویسی کی مثالیں ہیں۔ سودا، انشا، رنگین، نظیر وغیرہ نے انھی مضامین پر خاصی لیپا پوتی کی ہے۔ لیکن اگر انگریزوں کی عینک سے دیکھیے تو ساری ہندستانی شاعری پر فحش نگاری کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ جملہ دواوین کے علاوہ نعمت علی خاں کی حسن و عشق[1]، پنج رقعہ، مینا بازار اور شبنمِ شاداب کو کس زمرے میں رکھیے گا۔ غنیمت ہے کہ ان کتابوں کا شمار رنگین اور جان صاحب کی خرافات کے ساتھ نہیں ہوتا، ورنہ یہ تو بے انصافی کی انتہا ہو جاتی اگر ترازو کا پلّا اتنا جھکایا گیا تو انتہائی تخیل کے نادر نمونوں پر بھی احتساب کرنا ہوگا اور ہمارا سارا ادب مردہ قرار دے دیا جائے گا۔ مثلاً 'حسن و عشق'، کو ہی لیجیے۔ اس میں شادی بیاہ کی رسموں اور تیوہاروں کی ریتوں کا کتنا اچھا بیان کیا گیا ہے۔

اب انگریزی کو لیجیے۔ کیوں یہ برگزیدہ بندوں کی زبان ہے جن کے سینوں میں علم کی برکتیں موجیں مار رہی ہیں اس لیے انھیں نہ فحشِ ظاہر کی ضرورت ہے نہ فحشِ مستور کی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ننگی تصویریں اور ننگے مجسمے ان کے گھروں کی زینت بڑھاتے ہیں۔ لیکن اسے کوئی عیب نہ سمجھیے۔ عربی کی کہاوت ہے کہ بھودار وں کا کوئی کام سمجھ سے خالی نہیں۔ ایک ذرا لارڈ بائیرن کے کلام کو لیجیے۔ شراب و شباب کے ذکر میں انھوں نے کیا کیا موشگافی نہیں کی ہے۔ پھر بھلا اردو و فارسی کے غریب شاعروں نے کیا جرم کیا ہے۔ اپنا اپنا پیرایۂ اظہار ہے ورنہ مضمون تو دونوں کے ایک ہی ہیں۔ اس صورت میں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بے چارے کتب فروشوں

[1] اسی نام سے اردو میں ایک اور مثنوی لکھی گئی ہے جو غلام حیدر عزت نے تصنیف کی ہے۔

کو دو دو پیسے کی کتابیں بیچنے کے جرم میں سزا دی جائے۔ درآں حالیکہ حکومتِ وقت اب تک 'فحش' و 'مہذب' کے مابین کوئی تمیز نہیں کر سکی۔ کتب فروشوں سے اس شعور کی توقع کیوں کی جاتی ہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ڈر کے مارے وہ ہر قسم کی کتابیں بیچنا بند کر دیں گے۔

سوال یہ ہی کہ بداخلاقی کی ترغیب دینے والی کتابوں کی اشاعت کو روکنے کا طریقہ کیا ہی؟ اس کا فیصلہ کوئی ایک آدمی نہیں کر سکتا اور اگر اس غرض سے کوئی کمیٹی مقرر کی جائے تو اُسے بھی مشکلات سے دوچار ہونا ہوگا۔ لیکن آج علم کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ہر کس و ناکس اس میں داخل ہو کر فیض یاب ہو سکتا ہی۔ لاہور کی انجمن کو یہ فضیلت حاصل ہی اور وہ نیک و بد کی تمیز کر سکتی ہی۔ اگر اس کے ارکان فرداً فرداً کچھ کتابیں لا کر ان کا تجزیہ کریں تو کچھ عرصے میں مخرب اخلاق کتابوں کی فہرست تیار ہو سکتی ہی اور ان کی اشاعت بند کی جا سکتی ہی کیوں کہ فہرست کئی لوگوں کی رائے اور باہمی مشورے کے بعد تیار ہوگی اس لیے شکایت کی کوئی گنجائش نہ ہوگی اور عدالت کو بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ تاہم اس قسم کا اقدام کرنے سے پہلے یہ ضروری ہی کہ یہ مشتہر کر دیا جائے کہ فحشیات کی حد کس نقطے سے شروع ہوتی ہی تاکہ بعد میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ یہ ضروری ہی کہ پریس، کتب فروش اور مصنف سب کو معلوم ہو جائے کہ ان کی ذمے داری کیا ہی تاکہ وہ خواہ مخواہ اپنے کاروبار سے ہی بد دل نہ ہو جائیں۔ اگر کسی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں کوئی شک نہیں۔ کلیاتِ سودا اور کلیاتِ میر انشا کا بھی یہی حال ہے۔ انشا کے دیوان ریختی کے بیش تر حصّے کو قطعاً ممنوع قرار دینا چاہیے۔ میاں رنگین اور جان صاحب کی ریختی کے دیوان ان سے ہرگز بہتر نہیں۔ یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ان شاعروں کا اصل منشا یہ تھا کہ عورتوں کی زبان ادب میں آجاتے۔ اس لیے ان کی کانٹ چھانٹ نہایت احتیاط سے ہونی چاہیے۔

یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ ہندستانی شاعری کے دن بیت گئے اور جلد وہ دن آنے والا ہے جب شعر و شاعری کا چرچا ختم ہو جائے گا۔ آٹے دال کی تلاش میں سب کا قافیہ تنگ ہے اور کسے فرصت کہ شاعری میں وقت گنوائے۔ اگر کسی من چلے نے کچھ لکھ بھی دیا تو پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ جب شاعری خود ہی مر رہی ہے تو اس بے چاری پر احتساب بٹھانے سے کیا حاصل"۔

پنڈت کرشن لال کی تقریر کے بعد کئی حاضرینِ جلسہ نے ان کی حمایت میں بہت کچھ کہا۔ آخر کار طے پایا کہ اگلے جلسے میں ایسی قراردادیں تجویز کی جائیں گی جو حکومت کے سامنے پیش کی جا سکیں۔

اس عرصے میں کتب فروشوں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ اُن لوگوں نے لاہور سے ایک عریضہ حکومت کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا ہے کہ قانونِ امتناعِ فحشیات کی صاف صاف تشریح ہونی چاہیے۔ (علی گڑھ اخبار ۱۲ جون ۱۸۷۴ء) ان کے ایک نمایندے نے اخبارِ پنجابی[۱] میں یہ مضمون شایع کیا ہے۔

[۱] ۲۱ مارچ ۱۸۷۴ء

کی سرگزشت ہے۔ اس کے فحش ہونے میں کلام نہیں لیکن باوجود اس کے اُسے قبولِ عام حاصل ہے۔

جامی کی یوسف وزلیخا دراصل سورۂ یوسف کا شاعرانہ ترجمہ ہے۔ اس کے بعض حصّے شہوت انگیز ہوں تو ہوں لیکن ہندستان میں یہ فسانہ از حد مقبول ہے۔

دیوانِ حافظ صوفیوں کی آنکھوں کا سُرمہ ہے اور ان کی مجلسوں میں اس کی غزلوں کی دھوم رہتی ہے۔ ان میں وہ حقیقت ومعرفت کے چشمے اُبلتے دیکھتے ہیں۔ لیکن رنگین مزاج حافظ کے کلام میں حسن وعشق کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں۔

بہرحال اجداد کا یہ وطیرہ ہمیں پسند نہیں کہ اخلاق کی تلقین حکایت وروایت کے پردے میں کی جاتے کیوں کہ ان میں دلچسپی کے لیے محبت کی پٹ بھی شامل کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ دستور مسلّمہ ہے تو حکومت سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کہ صرف کلیات [illegible] زٹلی اور لذت النسا جیسی کتابیں موردِ عتاب ہیں یا مذکورہ کتابوں پر بھی تحدید عائد ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی کتب فروشوں پر ان کتابوں کی اشاعت کے جرم میں جرمانے ہو چکے ہیں۔ ہم یہ ماننے کو تیار ہیں کہ ان دونوں کتابوں میں بداخلاقی کی جھلک ملتی ہے[1] اس کے باوجود اس باب میں حکومت کا رویّہ یکساں نہیں ہے۔ لکھنؤ میں بہارِ عشق اور زہرِ عشق بیچنے والوں پر برائے نام ایک ایک رُپیہ جرمانہ

[1] اسے حُسنِ ظن سمجھنا چاہیے۔ مؤلف

ہوا۔ کلیاتِ جعفر زٹلی اور لذت النسا کی بکری پر لاہور، کرنال، سیال کوٹ، ملتان اور جہلم میں مختلف جرمانے وصول کیے گئے۔ زیادہ طول کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون سی کتابیں قابلِ ضبطی ہیں تاکہ ہم حکومت کے احکام کی پابندی کر سکیں۔ ورنہ اس بےعیص بیص میں کاروبار کو ترقی دینا ہمارے بس کی بات نہیں۔"

اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ بھی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ 'فحشیات' کے حدود متعین کر دیے جائیں اور اس کا فیصلہ ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ ایڈیٹر کا خیال ہے کہ اس مسئلے میں اہلِ ایشیا اور اہلِ یورپ کی آرا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مثال کے طور پر وہ ایک نئی نظم 'آئینۂ حسن'، کا نام لیتا ہے جس میں شاعر نے کسی حسین عورت کا سراپا بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صنفِ سخن کے بعض حصّوں کو ہر یورپین شاعر مکروہ سمجھے گا۔ ایڈیٹر کا خیال ہے کہ اس قسم کی لفظی موشگافی سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ادب قابلِ اعتراض ہے جو انسان کو قتل و غارت گری کی طرف رجوع کرتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے لیکن نہ کوئی مصنّف اور نہ کوئی اخبار نویس ادھر توجہ کرتا ہے۔

(۳)

حال ہی میں حکومتِ وقت نے ہندستانی پریس پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ یعنی ہندستان، برما یا سیلون کے کسی اخبار کو

کوئی خبر بھیجنی ہو تو ڈاک کا محصول صرف چوتھائی دینا ہوگا۔

۱۸۷۴ء کے آغاز میں آگرہ و اودھ کے صوبوں میں اخباروں کی تعداد ۳۶ اور رسالوں کی ۹ تھی [له]

۱۸۷۳ء میں ہندستان و برما میں سب ملاکر ۴۷۸ اخبار نکلتے تھے۔ ان میں سے ۱۵۱ انگریزی میں ۲۵۵ دیسی زبانوں میں اور باقی نیم انگریزی نیم ہندستانی میں ہوتے تھے۔ بمبئی میں ۱۱۸، بنگال میں ۹۸، مدراس میں ۴۸، آگرہ و اودھ میں ۳۷، پنجاب میں ۱۴ اور راج پوتانے میں صرف ۳ اخبار شایع ہوتے تھے۔ دیکھنا یہ ہو کہ ان اخباروں سے کتنے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ہر اخبار کے خریدار سات سو آدمی ہیں تو ان کے جملہ خریدار تقریباً تین چار لاکھ ہوں گے۔ یوں کہیے کہ ملک کا ایک چھوٹا سا طبقہ اخبار بیں ہو اور اس میں بھی انگریزی پڑھنے والے یورپینوں اور ہندستانیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ ہندستانی اخباروں میں سے اکثر کا حلقۂ اشاعت تو بہت محدود ہو۔

یہ رائے اخبار انجمن پنجاب کے ایڈیٹر کی ہو۔ اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخباروں کی اشاعت اور اثر میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہو۔

اخبار 'پنجابی' (۲۵ اپریل ۱۸۷۴ء) میں لسواد کے نواب عمر علی خاں کا جو خط شایع ہوا ہو، وہ اس قدر مایوس کن نہیں۔ البتہ وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہندستانی اخبار بینی کی اہمیت سے

[له] Allen's Indian Mail ۲۷ جولائی ۱۸۷۴ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مولوی غلام محمد تپش کا نام اس کی ادبی خوبی کی ضمانت ہی۔

ہرش چندر پترکا کو بجا طور پر خاص وعام کی قدر افزائی حاصل ہی۔ بابو ہرش چندر بہ یک وقت نازک خیال شاعر اور نکتہ رس انشا پرداز ہیں۔ انگریزی نظم و نثر پر بھی انھیں قدرت حاصل ہی۔ ان کا رسالہ اس لحاظ سے بھی خوب ہی کہ اس میں قدیم ہندی شاعروں کے کلام کا انتخاب درج ہوتا ہی۔ یہ کلام اب صرف قلمی نسخوں تک محدود ہی۔ کئی مشہور عالم ان کے معاون ہیں۔ ایک تو بابو گدادھر سنگھ جنھوں نے ہندی میں سنسکرت رومان 'کادمبری' کو منتقل کیا ہی اور بابو گوکل چند جنھوں نے بنگالی ناول 'کپال کنڈلا' کا ترجمہ کیا ہی۔ منشی کاشی ناتھ نے علی گڑھ اخبار (۱۲ جون سنہ ۷۴ء) میں اس رسالے کی بڑی تعریف کی ہی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نکتہ چینی بھی کی ہی کہ بابو ہرش چندر ایک طرف تو انگریزی کے استعمال کے مخالف ہیں، اور دوسری طرف خود اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ اس کثرت سے لاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بڑی اُلجھن ہوتی ہی۔

سیتاپور کی انجمن ترقیٔ تہذیب اپنے جلسوں کی ماہانہ روئداد برابر شایع کرتی رہتی ہی۔

کلکتے سے ایک نیا جریدہ (STUDENT) (اسٹوڈنٹ) کے نام سے نکلنے والا ہی۔ اشتہار میں یہ نہیں بتلایا گیا کہ اس کی زبان کیا ہوگی۔ اس میں تعلیمی مسائل پر بحث ہوا کرے گی

کلکتے سے 'ہنر اور پیشہ' کے نام سے ایک مفید اخبار جاری ہوا ہی۔

اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہی تاکہ اس کی اشاعت محدود نہ رہے
ہندستانی جرائد کے مضامین کے نفس یا معیار کے متعلق کوئی
نئی بات نہیں کہنی ہی۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی کہ اپنے سالانہ ریویو
کا بیش تر مواد مجھے انھی جرائد میں ملتا ہی۔ اب میں چند قابلِ غور
مضامین کا تھوڑا سا ذکر کرتا ہوں۔ اخبارِ انجمن پنجاب نے ان
خطابات کا چرچا کیا ہی جو حکومت کی طرف سے ہندستانیوں
کو ملنے لگے ہیں۔ اخبار پوچھتا ہی کہ یہ کیا ضرور ہی کہ لوگ صرف
رائے بہادر یا خان بہادر کہلائیں۔ آدمی کے منصب کے لحاظ
سے خطاب میں تبدیلی کیوں نہ ہونی چاہیے مرزا علاءالدین احمد خاں صاحب
بہادر نواب لوہارو کو فخرالدولہ کا خطاب اخبار کو عین پسند ہی۔
ایک دوسرے اخبار نویس کی رائے ہی کہ ہر آدمی کو صاحب نہ
کہا جائے بلکہ یہ بھی ایک سرکاری خطاب قرار دیا جائے۔

گزشتہ سال میں نے اس جشن کا ذکر کیا تھا جو سیّد احمد خاں
نے اپنے بیٹے کی انگلستان سے واپسی پر منعقد کیا تھا اور جس
میں ہندستانی و فرنگی دونوں شریک تھے۔ میں نے یہ خیال بھی
ظاہر کیا تھا کہ اس قسم کے جلسے نہایت مفید ہیں کیوں کہ یہ دونوں
قوموں کے افراد کو ایک دوسرے سے قریب لاتے اور انھیں
ایک دوسرے سے واقف ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ اخبار
پنجابی نے بھی یہی بات کہی ہی۔ وہ لکھتا ہی کہ انگریزوں اور
ہندیوں میں آسانی سے ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہی۔ آگے چل کر

لہ پنجابی ۷ نومبر ۱۸۷۳ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

درج ہیں۔ شروع میں ایک سرکاری اشتہار کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: "بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی ابتری کا گزشتہ گورنر جنرل لارڈ میو کو سخت احساس تھا۔ ۱۸۷۱ء میں انھوں نے اس مسئلے کو چھیڑا اور خواہش ظاہر کی کہ حاجی محمد محسن کے وقف کا بہترین استعمال کیا جائے تاکہ علم کے ہر شعبے میں مسلمان بھی وہی مرتبہ حاصل کرسکیں جس پر ہندو آج سرفراز ہیں۔ ان کی مرضی کے مطابق بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جی۔ کیمپ بیل نے حکم صادر کیا کہ صوبے کے مشرقی اضلاع (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) کے اسکولوں میں عربی و فارسی کے استاد مقرر کیے جائیں۔ نیز حاجی محسن کے وقف کی آمدنی محض ہگلی کے مدرسے پر صرف نہ کی جائے بلکہ مسلمانوں کے دوسرے مدرسے بھی اس سے مستفید ہوں اور ان میں انگریزی کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے۔ موجودہ گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے پچاس ہزار روپے عنایت فرمائے ہیں۔ یہ طے پایا ہے کہ کلکتہ کے مدرسے کے نمونے پر ہگلی، ڈھاکہ، رنگ پور اور چاٹ گانو میں نئے مدرسے قائم کیے جائیں گے۔ ان اداروں میں فارسی، عربی و فقہ کی تعلیم دی جائے گی۔ لڑکوں کی رہائش کے لیے بورڈنگ ہاؤس بھی ہوگا اور ان میں نادار طلبا پر اخراجات کا بار نہ ہوگا۔

حکومتِ بنگال کے یہ احکام مسلمانوں میں مشتہر کیے جائیں گے تاکہ ان کے سربرآوردہ اصحاب اس تحریک کی رہنمائی کریں اور خاص طور پر اپنے غریب بھائیوں کو تعلیم کا راستہ دکھائیں۔ امید

ہو کر مسلمانوں کا خوش حال طبقہ دامے، درمے تعلیمی اداروں کی مدد کرے گا تاکہ ان کی تعداد بڑھ سکے اور حاجی محمد محسن کی خواہش کے مطابق تعلیم کا انتظام کیا جا سکے"۔

اس فرمان کے ساتھ حسبِ ذیل تین احکام نتھی کیے گئے ہیں:۔

(۱) ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی رپوٹ پر وائس رائے بہادر کا ارشاد۔

(۲) بنگال کے لیفٹننٹ گورنر کا فرمان کہ حاجی محمد محسن کے وقف کی آمدنی مسلمانوں کی تعلیم کے علاوہ اور کسی صیغے پر صرف نہ کی جائے۔

(۳) موصوف کا یہ فرمان کہ تین نئے کالج کھولے جائیں اور غریب مسلمانوں کے بچّوں کو تعلیم کی آسانی بہم پہنچائی جائے۔ ۳۰ صفحات کے کتابچے کے بیش تر حصّے میں یہی احکام نقل ہیں۔

شمال و مغرب کے صوبوں میں سرکاری اسکولوں کے ساتھ مدرسے بھی قائم کیے جائیں گے جن میں صرف فارسی و عربی کی تعلیم دی جائے گی اور اُن پر دس ہزار روپے سالانہ صَرف کیے جائیں گے۔

بوہروں کی جماعت میں تو یوں بھی مذہب کا بڑا غلو رہتا ہے۔ اب اس نے سورت میں عربی کا ایک مدرسہ کھولا ہے[1]۔

دسمبر کے آغاز میں پنجاب یونی ورسٹی میں مشرقی امتحانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو لوگ کام یاب ہوتے انھیں سرکاری طور پر سنسکرت کے لیے پنڈت، عربی کے لیے مولوی اور فارسی اور

---

[1] علی گڑھ اخبار ۲ اکتوبر ۷۰ء

Allan's Indian Mail

[illegible]

رکھی تھی) ہندستانی میں ایک تقریر کی جس کا جواب سر ولیم میور نے اسی زبان میں دیا کیوں کہ اس پر انھیں کامل عبور حاصل ہے[۱]

مہاراجا جو پور کو جدید علوم سے خاص شغف ہے اور ہمیشہ ان کی اشاعت کے فکر میں رہتے ہیں۔ یہ بات ان میں اور ان کے جدّ امجد راجا جو سنگھ میں مشترک ہے جنھوں نے مغلوں کے عہد میں علم ہیئت کی بڑی خدمت انجام دی تھی۔ انھوں نے جو مختلف رصدگاہیں بنائی تھیں، ان میں سے ایک 'مان مندر' کے نام سے بنارس میں ہے۔ موجودہ مہاراجا نے اس کی ترمیم کے لیے دو لاکھ رُپے کی منظوری دی ہے[۲]

والیِ کشمیر کی طرح شہزادۂ ٹراونکور کو بھی سنسکرت زبان سے عشق ہے۔ وہ خود مدراس یونی ورسٹی کے طالبِ علم تھے اور ادبی و اخلاقی مسائل پر اکثر تقریر فرمایا کرتے ہیں۔ تعلیمِ عامّہ کے فوائد پر انھوں نے حال ہی میں ایک تقریر کی تھی۔ عیسائی نہ ہونے کے باوجود کنور صاحب پادریوں کو شرفِ باریابی بخشتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یورپ کے اخلاق کی اصلاح میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ تاہم پردیس کے اخباروں کے مطالعے نے ان پر یہ بھرم کھول دیا ہے کہ یورپ میں ہندستان سے کم جرائم نہیں ہوتے۔ ان کی رائے میں دونوں خطّوں کے متوسط طبقوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ البتہ عیسائیوں میں سے پست طبقے

---

۱ علی گڑھ اخبار، ۲ مارچ سنہ ۷۴ء

۲ Allen's Indian Mail ۱۰ فروری سنہ ۷۴ء

کے علاوہ — بد اخلاقی کی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ یورپ میں
کسی کو آسانی سے ’جھوٹا‘ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہندستان میں کتنی
بُری باتوں سے چشم پوشی برتی جاتی ہے۔ ان بُرائیوں کا واحد علاج
تعلیم ہے لیکن تا ایں دم کالجوں کا کوئی خاص اثر عام اخلاق پر
نہیں ہوا۔ کنور صاحب کو خوب معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے
بہت پہلے شاستروں نے اخلاق کی طرف توجہ کی تھی۔ لیکن
انھوں نے ضروری باتوں کے ساتھ فروعات کو بھی اتنی اہمیت
دی کہ سارا کیا دھرا بے کار ہو گیا۔ مثلاً شاستر میں کہا ہے کہ جھوٹ
بولنے والا دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ لیکن پیاز کھانے کی بھی یہی
سزا تجویز کی گئی ہے۔ تاہم کنور صاحب کا خیال ہے کہ دونوں علاقوں
میں کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی کیوں کہ بہر حال تان سزا و جزا
پر ہی ٹوٹتی ہے۔ دونوں مانتے ہیں کہ انسان کے عمل پر خدائے بزرگ
کی نگاہ ہے اور قیامت کے روز سب کے حُسن و قبح کی جانچ
ہوگی۔ جب عوام ان بنیادی اصولوں کو سمجھنے لگیں گے تو ان
کا اخلاق خود بہ خود سُدھر جائے گا۔ ان اصولوں کی بنیاد عیسوی
مذہب پر ہوگی۔ یہ سب باتیں کنور صاحب نے مدراس یونی ورسٹی
کے ایک جلسے میں کہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے علمِ تاریخ کی
اہمیت پر زور دیا اور بتلایا کہ مشاہیر کی تقلید اندھا دھند نہ ہونی
چاہیے کیوں کہ ان میں بھی خامیاں ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں
نے نپولین کا نام لیا جو مصر میں جھوٹ موٹ مسلمان بن گیا اور
دھوکے سے (ENGHIEN) کے ڈیوک کو قتل کرا دیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جالندھر میں مسلمانوں کا کالج بن چکا ہی اور امرت سر کا کالج تو شاہ راہِ ترقی پر گام زن ہی جیسا کہ سالانہ امتحان کے شان دار نتائج سے ظاہر ہی۔

سالِ گزشتہ میں کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحانات میں ۲۵۴۵ طلبا شریک ہوئے۔ ان میں سے ۸۴۳ کام یاب ہوئے۔ بی۔ اے کے پہلے امتحان میں ۵۳۹ میں سے ۳۰۱ کو کام یابی ملی۔

بعض لوگوں کا خیال ہی کہ اس یونی ورسٹی کو طالبات کے داخلے کا بھی انتظام کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی تعلیم کی برکتوں سے مستفید ہو سکیں۔ سوال یہ ہی کہ کیا پردہ نشین خواتین مردوں کے تیار کردہ نصاب کے مطابق امتحان پاس کرنے کے لیے آمادہ ہوں گی؟۱؎ انھیں یہ کہیں زیادہ پسند ہوگا کہ ستار بجائیں اور اب تو انھیں اسے سیکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی کیوں کہ میرٹھ سے اردو میں "معلم الستار" نامی کتاب شایع ہو رہی ہی۲؎

بمبئی میں ۱۰۲۵ طلبا میں سے صرف ۳۵۵ کو کام یابی نصیب ہوئی۔

یہ ضروری ہی کہ انڈین سول سروس اور کمپنی کی اسامیوں کے لیے جو امتحانات ہوتے ہیں، وہ قدرے آسان ہو جائیں۔ کیوں کہ فی الحال دو سال کی قلیل مدت میں امیدواروں کو یورپ و ایشیا کی قدیم و جدید زبانوں کے علاوہ تاریخِ عالم، ریاضی اور

۱؎ Allen's Indian Mail ۹ جنوری سنہ ۷۴ء

۲؎ اخبارِ عالم میرٹھ ۲۰ اگست سنہ ۷۴ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور اس کے نئے ناظم برکت علی ملک و قوم کے سچے بہی خواہ ہیں۔ انجمنِ پنجاب جیسے ادارے کے لیے ایسے ہی بیدار مغز ناظم کی ضرورت ہے۔

علی گڑھ سوسائٹی کے سکریٹری راجا جے کشن بہادر کا تبادلہ الہ آباد ہوگیا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں جب سید احمد خاں نے کرسیِ نظامت خالی کی تو موصوف ان کی جگہ اس منصب پر منتخب ہوئے اور اپنے فرائض ایسی قابلیت سے انجام دیے کہ اب انھیں سوسائٹی کا آنریری صدر نامزد کیا گیا ہے۔ سکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی محمد سمیع اللہ خاں کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

انجمنِ ترقیِ قومِ ہنود Hindu National Improvement Society کے صدر راجا صاحب ٹالور ہیں۔ حسبِ دستور یہ انجمن ہندوؤں کی ذہنی، لسانی و اخلاقی ترقی کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ انگریزی سے ہندستانی زبانوں میں مذہبی کتابیں منتقل کرے اور دوسرا یہ کہ یتیم خانوں اور صنعتی مدارس کو مدد بہم پہنچائے۔[1]

انجمن دہلی ۱۸۶۵ء میں وجود میں آئی تھی۔ اب اس کے سکریٹری منشی تارا چند ہیں۔ ان سے پہلے پیارے لال تھے جو اب پٹیالہ کے محکمۂ تعلیم کے ناظم ہیں۔ شاہانِ مغلیہ کی قدیم راج دھانی کے خواص اس انجمن کے ارکان میں ہیں۔ اس کے جلسوں میں اکثر دل چسپ مقالے پڑھے جاتے ہیں جن پر بصیرت افروز مباحثے

---

[1] Journal of the National Indian Association ۱۰ مئی ۷۴ء

ہوتے ہیں اور پھر ان کا خلاصہ انجمن کے ماہنامے میں شایع ہوتا ہے۔

پچھلے سال کے ماہِ ستمبر میں مظفر پور کی علمی و ادبی انجمن کی شاخ پٹنہ میں سید وزیر علی خاں کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس کے دوامی ناظم مولوی سید امداد علی خاں ہیں۔ جنھوں نے ہندستانی میں متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کے نائب حافظ سید احمد رضا ہیں جنھوں نے انجمن کے پہلے جلسے میں ایک پُر جوش تقریر کی۔ 'اخبار الاخیار' نے اسے اپنے شمارۂ یکم اکتوبر ۱۸۶۳ء میں چھاپا ہے۔ بہار سوسائٹی کا سالانہ جلسہ گیا میں گزشتہ ۲۸ اگست کو ہوا تھا۔ اس کی صدارت وہاں کے مجسٹریٹ M.E.GREY صاحب نے کی تھی۔

گجرانوالہ میں انجمن فیضانِ عام کی داغ بیل رکھی گئی ہے۔ اس کے مہتمم ڈاکٹر جے سنگھ ہیں اور ارکان میں شہر کے رؤسا و علما شامل ہیں۔ اسی شہر میں انجمنِ اسلامیہ بھی وجود میں آئی ہے جس کا واحد مقصد مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر زور دینا ہے۔ اس کے سکریٹری کی رائے ہے کہ سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کا شعبہ ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی مدرسوں کو از سرِ نو تقویت پہنچانی چاہیے۔

دہلی کے مضافات میں ایک مقام عرب سرائے ہے۔ یہاں بھی ایک انجمن ہے۔ یہ چھوٹی سی سہی لیکن دوسری علمی انجمنوں سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ شایع کرتی ہے جو اپنی آزادیِ رائے کے لیے مشہور ہے۔ اس کی نگرانی میں کئی کتابیں تصنیف

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

ہندوؤں کو بھی خوابِ خرگوش سے جگایا ہو اور وہ ان خیالات پر عمل کرنا چاہتے ہیں جن کا اظہار ایک خط میں ہوا تھا جسے میں سالِ گزشتہ کے مقالے میں درج کر چکا ہوں۔

سنسکرت زبان و انشا کی ترویج کے لیے بلند شہر میں بھی ایک کمیٹی بنی ہو۔ پچھلی ۱۰ فروری کو اس کا جو جلسہ ہوا اس میں کئی لوگوں نے چندے دیے۔

اُدھر سوان کے ٹھاکر گرُ پرشاد نے اپنے صدر مقام میں سنسکرت کا اسکول کھول رکھا ہو۔ یورپ میں اس پُرانی زبان کا جو چرچا ہوا ہو اس سے ہندوؤں میں بڑا شوق پیدا ہو گیا ہو اور اب اپنے دیس میں بھی اسے چلن دینے کے جتن کر رہے ہیں۔ جو طبقہ اس تحریک کی رہ بری کر رہا ہو اس کے اثر کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کوشش کام یاب ہو جائے تو عجب نہیں۔ بہت ممکن ہو کہ مسلمانوں کے مجوزہ کالج کے وزن پر وہ بھی ایک مرکزی ہندو کالج کی پیروی کریں۔

پچھلے سال کی آخری تاریخ کو آگرہ کی 'انجمن آثارِ قدیمہ' کا جلسہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ خصوصاً راج پوتانے کی قدیم عمارتوں کی تحقیق کرے تاکہ تاریخ کے دُھندلے نقوش صاف ہو سکیں۔ قلمی کتابوں کی تلاش اس کا دوسرا مقصد ہو[1]

اگر ان کی نظر زمانۂ حال کی تاریخی عمارتوں پر بھی پڑے تو بڑا اچھا ہو۔ اس سلسلے میں مجھے ٹیپو سلطان کے محل "دریِ دولت"

[1] اخبارِ عالم میرٹھ ۱۵ جنوری

کا خیال آتا ہے۔ یہ محل میسور کی راج دھانی سرنگا پٹم میں بنا ہوا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندستانی اخبار نویس لکھتا ہے[1]:

"جب ٹیپو اور انگریزوں میں لڑائی چھڑی ہوئی تھی تو بہت سے قیدی اس کے ہاتھ لگے۔ سلطان نے انھیں حکم دیا کہ محل کی دیواروں پر ایسے نقش و نگار بنائیں جو اس کے لیے دل چسپی کا موجب ہوں۔ لیکن قدرت خدا کی کہ ایک روز ٹیپو کو شکست ہوئی اور اسے سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گورنر جنرل نامزد ہونے کے بعد لارڈ ولزلی نے محل کی مرمت کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم علاحدہ کی۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہندستانی آرٹ کا یہ نادر نمونہ کس مپرسی کی حالت میں ہے اور اتنا شکستہ ہو چکا ہے کہ اگر جلد اس کی خبر نہ لی گئی تو بالکل نابود ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس عمارت کی حفاظت سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو لارڈ ولزلی کی یادگار قائم رہے گی دوسرے جو بھی محل کے در و دیوار اور تصاویر کو دیکھے گا اسے عبرت ہو گی کہ تکبر کی سزا تنزل ہے۔ علاوہ بر ایں یہ میسور کی عمارت سازی کا عجیب و غریب نمونہ ہے جسے زندہ رہنا چاہیے۔"

اُدھر "برہمو سماج" کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ بہتیرے شریف و معزز لوگ اس کے عقائد پر ایمان لاتے جاتے ہیں۔ ان میں بتیا کے مہاراج کمار بھی ہیں۔ سماج کی پوجا میں صرف ایک مرتبہ شریک ہو کر وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے

[1] پنجابی ۲۰ فروری سنہ ۷۳ء

زمرے میں شامل ہو گئے۔ جاورا راج کے وزیر سماج کے زبردست مبلّغ ہیں اور خاص طور پر دہلی و بنگلور میں سماج کا بڑا چرچا ہی۔ اس کامیابی سے بابو کیشب چندر سین کا دل بڑھ گیا ہی اور وہ ملک بھر میں دوْرہ کرکے اپنے مت کا پرچار کر رہے ہیں۔ ان کے خطبوں کا ایک ہی رنگ ہوتا ہی۔ اس لیے امرت سر وغیرہ میں انھوں نے حال میں جو کچھ کہا ہی اسے دُہرانا نہیں چاہتا۔

گزشتہ ۱۲ دسمبر کو الہ آباد میں برہمو سماج کے قیام کی سال گرہ منائی گئی۔ پوجا گھر میں پھولوں کے ہار مہک رہے تھے، فضا منتروں کے جاپ سے گونج رہی تھی اور بھکاری جو دُور دُور سے آئے تھے ہتھی گرم کرکے مگن ہو رہے تھے۔ سچ تو یہ ہی کہ اسے عیسوی مذہب کا ایک ایسا فرقہ سمجھنا چاہیے جو عیسیٰؑ کا نام لیے بغیر راہِ راست کی طرف لے جاتا ہی[1] کم از کم پادری وائسی (VOYSEY) کا تو یہی خیال ہی کیوں کہ ایک اتوار کو انھوں نے بابو کیشب چندر سین کے نمایندے پرتاپ چندر کو اپنے گرجا گھر میں تقریر کرنے کی اجازت دی بلکہ پادری صاحب نے ایسی اعلا ظرفی کا ثبوت دیا کہ اپنے خطبے میں عیسیٰؑ کا نام تک نہ آنے دیا اور موقع کے لحاظ سے نہایت مناسب باتیں کہیں۔[2] یہ وہی پرتاپ چندر ہیں جنھوں نے مینچسٹر (انگلستان) کے ایک کلیسا میں انجیل کے ایک موضوع کو لے کر تقریر کی تھی۔ اس کے

---

[1] کوی وچن سُدھا ۲۶ جنوری ۱۸۷۴ء

دوران میں انھوں نے کہا تھا کہ ابتدا میں ہندو توحید پرست تھے اور برہمو سماج کا مقصد اسی تعلیم کی تجدید اور جہالت و اوہام کا انسداد ہے۔

اسی شہر مینچسٹر میں سالِ رواں کے اوائل مارچ میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن National Indian Association کا عام جلسہ ہوا۔ اس کی بانی Miss Mary Carpenter کے علاوہ چار ہندستانی بھی شریکِ جلسہ تھے۔ حاضرین نے انجمن کے مقاصد کو سراہا اور اس تجویز پر صاد کیا کہ شہر میں اس کی شاخ قائم کی جائے جس کے صدر مسٹر Hugh Masson ہوں۔ ایسوسی ایشن کی سکریٹری Miss E. A. Manning ہیں جن کے سسٹر Ancient and Mediaeval India نامی کتاب کے نامور مصنف ہیں۔

اسی زمانے میں لندن کے مشہور ڈاکٹر لائٹنر Leitner اور ان کی بیوی نے ہندستانی باشندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں وہ انگریز بھی مدعو تھے جو مشرقی چیزوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ دعوت میں امیر کابل کے بھتیجے شاہزادہ سکندر احمد بارک زئی، شاہ اودھ کے نمایندے کلب علی خاں، مس مینگ وغیرہ معززین بھی موجود تھے[1]

اگر ہندستانیوں کو یورپینوں سے گھلنے ملنے کا موقع ملے تو انھیں بڑا فائدہ ہو۔ عربی زبان کی یہ کہاوت خوب ہے کہ سفر کو ظفر کا

[1] Indian Mail ۲۴ اگست ۱۸۷۰ء

پہلا زینہ سمجھنا چاہیے۔

کچھ عرصہ پہلے لالہ بہاری لال نے لاہور میں توحید پرست ہندوؤں کی ایک منڈلی "ست سبھا" کے نام سے قائم کی تھی۔ اسے اپنے پیش رووں کی مذہبی اصلاح کے ساتھ علمی و ادبی ترقی کا بھی فکر ہی۔ سبھا کے کالج میں دیگر مضامین کے علاوہ دھرم کے اصول بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ سبھا کے بانی اور ان کے رفیقوں نے ان اصولوں کو بھجن کا روپ دیا ہی جسے طلبا بہ بانگِ دُہل گایا کرتے ہیں۔ یہ سب بھجن ہندی رسم خط میں "نیجھ پتر" کے نام سے کوئی ۲۴۴ صفحات کی پوتھی میں شایع ہوئے ہیں۔ کوئی بھجن خلوص و روانی سے خالی نہیں اور پوری کتاب خوش اخلاقی، کسرِ نفس اور عبادتِ الٰہی کی تلقین کرتی ہی[1]۔

برہمو سماج کی اصلاح پروری کے توڑ پر کٹر ہندوؤں نے دھرم سماج کے نام سے ایک تحریک چلائی ہی جس کا تذکرہ پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا ہی۔ ماہِ اگست میں اس کا جلسہ مظفر پور میں اس غرض سے ہوا تھا کہ سماج کے ہندی و سنسکرت کالج کے معاملات پر غور کیا جائے۔ اس کالج کے قیام میں حکومت نے بھی تعاون کیا ہی۔

اپنے سنہ ۷۲ء کے مقالے میں میں نے "کوکا" نامی سکھ فرقے کا ذکر کیا ہی جس نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا۔ اب مجھے ایک کتاب دست یاب ہوئی ہی

[1] پنجابی ۱۵ اگست سنہ ۷۴ء۔

(h)

اُٹھ جاگ کہ مغرب کا نورِ علم ہر طرف اُجالا کر رہا ہی۔ اپنی عظمتِ رفتہ کو یاد کر! کاش کہ تیری جہالت کا اندھیرا علم کے اُجالے کے آگے نہ ٹھیر سکے۔ دینِ حق تیری رہ بری کرے اور اصنامِ خیالی تجھے اپنا غلام نہ بنائے رکھیں"۔[1]

شمالی بنگال میں عیسائیوں کے ایک نئے فرقے نے جنم لیا ہی۔ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ اس کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں۔ ان کی دو رسمیں انوکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے کوئی جب بیمار ہوتا ہی تو علاج نہیں کرتا بلکہ عیسیٰؑ کا نام جپتا ہی۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ گوشت نہیں کھاتے۔ اس میں برہمنوں کا اثر صاف جھلکتا ہی۔[2]

گزشتہ مارچ میں بنگلور میں رومن کیتھولک کلیسا کے بشپ کی تعیناتی کی رسم ادا کی گئی۔ یہ عہدہ Chevalier صاحب کو ملا جو پہلے اسی شہر میں ایک کم تر عہدے پر فائز تھے تین بشپ اس رسم کی ادائی کے وقت موجود تھے۔ بڑی بھیڑ بھاڑ تھی اور اس کی وجہ غالباً یہ ہی کہ ہندستان میں اس قسم کی رسم کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

کلکتہ کے کئی کیتھولک عیسائی حال ہی میں گووا جیسی دُور دراز جگہ تیرتھ کی غرض سے پہنچے۔ وہاں سینٹ زیویر Xavier کا

---

[1] R—Mitra ——Journal of the National Indian Association – Jan 1874

[2] اخبار انجمن پنجاب ۱۶ جنوری سنہ ۷۴ء

مزار ہے۔

ریاست میسور میں ۱۸ ہزار سے زیادہ کیتھولک اور سات ہزار سے زیادہ پروٹسٹنٹ ہیں[۱]

برطانوی کلیسا کے جو تین بشپ ہندستان میں ہیں، باہمی مشورے کے لیے ناگ پور میں اواخر نومبر میں جمع ہوتے۔ عیسوی مذہب کے پرچار کے لیے جو مختلف سبھائیں کام کر رہی ہیں انھوں نے ان حضرات سے پوچھا تھا کہ ہندستانیوں کو عیسائی بنانے کے کارگر ذرائع کیا ہیں؟ اسی مسئلے پر غور کرنے کے لیے یہ جلسہ ہوا تھا۔ غور و خوض کے بعد انھوں نے انگلستان کے لاٹ پادریوں کے آگے یہ تجویزیں پیش کی ہیں: برطانوی پارلیمنٹ فلاں فلاں امور میں ہندستان کے پادریوں کو خود مختاری دے۔ کسی برطانوی یونی ورسٹی میں ایسے ہندستانی طلبا کو اسکالرشپ دیا جائے جو آگے چل کر تبلیغ کا کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جن عیسائی اسکولوں میں ملکی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے ان کے مدرسوں کو معقول تنخواہیں دی جائیں۔ اور ملکی زبانوں میں عیسوی مذہب سے متعلق کتابیں لکھوائی جائیں[۲]

عیسائی مشنری محض مذہبی تحریروں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ دوسرے علوم میں بھی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے سہ ماہی رسالے کے پانچویں نمبر کو لیجیے جو گزشتہ جولائی میں شایع

[۱] علی گڑھ اخبار ۱۹ جون سنہ ۷۲ء

[۲] Colonial Church Chronicle جولائی سنہ ۷۲ء

[illegible]

روادار اور فیض رساں ہے[1]۔ خیر، کوٹ گڑھ کے ۴۲ آدمی تو دیکھتے ہی دیکھتے عیسائی ہوگئے اور مشن اسکول میں پڑھنے کے لیے ۱۹۹ پہاڑی بچے آنے لگے۔ اب تو مہاراجا کے سگے بھائی جالندھر میں دینِ عیسوی پر ایمان لے آئے ہیں۔

دہرہ دون چائے کمپنی نے ۱۷ گاؤں دیسی عیسائیوں کو بسانے کے لیے بیچ دیے ہیں۔ اس نوآبادی کا نام "امیدآباد" HOPE TOWN رکھا جائے گا۔

برطانیہ کے لاٹ پادری کے صدر مقام کینٹربری کے مذہبی مدرسے میں ہندستان کے لیے ایک خاص شعبہ کھولا گیا ہی۔ اس میں ایسے مبلّغ تیار کیے جائیں گے جو وہاں جاکر کام کریں۔ انھیں ہندستانی زبان و رسوم، مذہب و فلسفے کی تعلیم ملے گی تاکہ وہ اپنی خدمات بہتر طریقے سے انجام دے سکیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہندستان میں ان کا کام آسان ہوتا ہی۔ ابھی حال ہی میں مدراس میں ایک ہندو نوجوان عیسائی بن کر مشن میں رہنے لگا۔ اس کے باپ نے پادریوں پر مقدمہ قائم کیا لیکن عدالت نے اس کی بات نہ مانی کیوں کہ لڑکے نے کہ دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا ہی۔ بگڑے دل باپ نے جتھا بنا کر مشن پر دھاوا بول دیا اور پادری کو بُری طرح زخمی کیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ پولیس موقعۂ واردات پر پہنچ گئی[2]۔

کیمبرج یونی ورسٹی کی عیسائی یونین میں تقریر کرتے ہوتے

[1] پنجابی ۲۶ ستمبر ۷۴ء

[2] Colonial Church Chronicle مئی ۷۳ء

حال ہی میں (Sir Bartle Frere) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گزشتہ چالیس سال کے اندر ہندستانی سماج میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مغربی تہذیب کے بُرے عناصر داخل ہو رہے ہیں۔ اگر عیسائی مت کے پرچار نے توازن قائم نہ کیا تو سماج پر اس اثر کا ردِّ عمل بہت بُرا ہوگا[۱]

لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ مشنریوں کی ہمت افزائی کریں۔

۳۱ مارچ کو لندن میں ایک سوسائٹی کا جلسہ نارائن شیشادری نامی برہمن کے اعزاز میں ہوا جو اب عیسوی مذہب اختیار کر کے اس کی تبلیغ کا کام کر رہا ہے۔ لندن کے بشپ ڈاکٹر جیکسن نے اس جلسے کی صدارت کی اور شروع میں جو کچھ کہا اس سے ثابت ہوگیا کہ ہندستان کے معاملات سے وہ بے خبر نہیں ہیں۔ ان کی بے تعصبی کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس برہمن کے قبولِ مسیحیت کا مقابلہ سینٹ پال سے کرتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی کہ وہ اپنے ملک میں ایمان کی مشعل روشن کرے گا۔ حاضرین میں ایک اور ہندستانی عیسائی بھی تھا۔ اس کا نام "سبرامینن" ہے اور یہ مدراس کا رہنے والا ہے[۲]

کیمبرج کے شعبۂ دینیات میں پادری ولیم صاحب نے بتایا کہ مشرق میں اسلام کی تبلیغ زور و شور سے ہو رہی ہے۔ قسطنطنیہ میں جو مذہبی مباحثے ہوئے ان میں مسلمانوں نے ایسی قابلیت دکھائی

---

[۱] Indian Mail ۱۶ مئی سنہ ۶۸ء

[۲] Indian Mail ۶ اپریل سنہ ۶۸ء

کہ بہت سے عیسائی فوراً مذہب بدلنے کو تیار ہو گئے۔ اس ضمن میں مقرر نے ایک نئی عربی کتاب کا ذکر کیا جس کا جواب مشرقی عیسائیوں سے نہ بن پڑا۔ اگر ان کی یہی حالت رہی تو اسلام کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ پادری موصوف نے عربی کے ایک مسودے کا ذکر کیا جو نو سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس میں اسلام پر بنیادی اعتراض کیے گئے ہیں اور طرزِ تحریر بھی قطعاً مشرقی اور پُر اثر ہے۔ اگر اسے زیورِ طبع سے آراستہ کیا جائے تو مسلمان مبلّغوں کی روک تھام ہو سکے۔ مسودے کا ایک نسخہ کیمبرج کے کتب خانے میں موجود ہے اور میرے دوست پروفیسر پالمر (PALMER) نے اسے طاقِ نسیاں سے نجات دلانے کا وعدہ کیا ہے۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندستان میں اسلام کو جو عروج حاصل ہوا اسے صرف زور زبردستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اصل سبب تبلیغ کے پُر اثر طریقوں میں ڈھونڈنا چاہیے۔ چنانچہ ہندوؤں کے پورے فرقے اسلام میں ضم ہو گئے۔ علاوہ بر ایں ملک بھر میں دونوں قوموں میں جو ملی جلی شادیاں ہوئیں انھوں نے بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا اثر بنگال میں خاص طور پر نمایاں ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تو ہے ہی اور پھر ان کی آبادی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوؤں اور بودھوں تک میں بیداری کا جو عدیم النظیر دور شروع ہو رہا ہے ہم اس کی اہمیت اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں لگا رہے ہیں؛ ورنہ عیسائی مبلّغ روحانیت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہ اسلام اس سے کہیں زیادہ صائب و صحیح پیغام کا حامل ہو[1]۔
طرفہ یہ کہ یورپین آبادی کے بعض افراد کبھی کبھی اُس اُلٹی گنگا میں بہ کر اپنا مذہب بدل لیتے ہیں۔ اس سال پنجاب کے مسٹر جونسن، سندھ کے دور ریلوے افسر اور ایک انگریز خاندان پر یہ اُفتاد گزری ہو۔ یہ خاندان چار آدمیوں پر مشتمل ہو جس میں ایک عورت بھی ہو۔
انھوں نے اب یہ نام قبول کر لیے ہیں: محمد عبدالرحیم، محمد ابراہیم، محمد اکبر اور محمدی۔ کوئی مادام لُبتی ہیں جنھوں نے ببمبئی کی زکریا مسجد میں مذہب بدل کر ہیرا احمد خاں نامی پٹھان سے شادی کر لی[2]۔ ببمبئی کے کشف الاخبار نے ان الفاظ میں اس واقعے کا ذکر کیا ہو: خدا کے فضل سے اسلام اب بھی سر بلند ہو۔ پچھلے جمعے کو ایک انگریز خاتون کو اپنی گُم راہی کا احساس ہوا اور راہِ حق پر آنے کی ہدایت ہوئی۔ چناں چہ اپنے بیٹے بیٹی سمیت وہ دینِ حق پر ایمان لے آئی۔ وہ ایک موسیے لبتی کی بیوہ ہو جنھوں نے ببمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان سے اس کے دو بچے تھے۔ اسلام نے اس کے قلب پر ایسا اثر کیا کہ مسجد میں آکر اس نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا اور اسی رات کو محمد خاں نامی افغان سے شادی کر لی[3]۔
اس زمانے میں اسی قسم کے دو اور واقعات ہوئے جنھوں نے ملک بھر میں کھلبلی ڈال دی۔ ایک تو SIR W. MAC NAGHTEN

---

[1] پنجابی ۲۴ جنوری سنہ ۶۷ء
[2] علی گڑھ اخبار ۱۳ جولائی سنہ ۶۷ء
[3] Indian Mail ۲۰ جولائی سنہ ۶۷ء

سرڈبلیو میکناٹن کی لڑکی کا ذکر ہو جو انگریزی فوج کے مقابلے میں افغانیوں کی ہار کے بعد مسلمان ہو کر اکبر خاں کے حرم میں داخل ہو گئی۔ یہی حال ہندستان کے گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کی بیوی کا ہوا جس نے ایک عرب شیخ سے بیاہ رچا لیا۔ ایک اخبار نویس نے ان مسمات کی زبان سے ایک شعر بھی کہوایا ہو جس کا مفہوم ہو کہ: "شومئی قسمت سے میں پیدا ہوئی کفر کی تاریکی میں، لیکن خوش نصیب کہ مجھے سچا راستہ مل گیا اور میں مسلمان ہو گئی"[1]

معلوم ہوتا ہو کہ ایک دو نہیں بلکہ بہ کثرت عیسائی اسلام اختیار کر رہے ہیں۔ اخبار پنجابی نے یہ بحث چھیڑی ہو کہ جو عیسائی مسلمان ہو جائیں ان کی گزر اوقات کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایمان کی خاطر ان بے چاروں کو سخت ناداری سے دوچار ہونا پڑتا ہو۔

اسی اخبار کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہو کہ ان نومسلموں کی دست گیری ساری ملت کا فرض اور اس کے لیے باعثِ افتخار ہو۔ یہ مناسب نہیں کہ جو لوگ عیسائی ہونے کی حالت میں خوش حال تھے اور محض جوشِ ایمان کی وجہ سے ایک کنبہ اور برادری سے بچھڑ گئے ہیں، وہ مسلمان ہو کر غربت و افلاس کی زندگی بسر کریں۔ نامہ نگار نے ان میں سے کئی کو لاہور کی شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے دیکھا ہو۔ اس معاملے میں مسلمانوں کو عیسائیوں کی پیروی کرنی چاہیے جو ضرورت کے وقت اپنے نئے بھائیوں

---

[1] میرٹھ ٹ ۲ نومبر ۱۸۶۳ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کی طرف سے شہر کے قبرستان میں ایک گولک رکھ دی جائے گی
جس میں فاتحہ خوان حسبِ مقدور چندہ ڈال دیا کریں گے۔[1]

اسی سلسلے میں علی گڑھ اخبار (۱۶ جون سالِ رواں) کے ایک مضمون کا اقتباس درج کرتا ہوں جسے پڑھ کر ناظرین کو یقیناً ہنسی آئے گی: جنھیں اپنے مذہب سے اُلفت ہے انھیں

نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ ہندستان کے تینوں بشپ جو عیسائی مبلّغوں کے قائد ہیں، یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کی تگ و دو کا کوئی اطمینان بخش نتیجہ ہنوز برآمد نہیں ہوا۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کا سیلاب اس اعتراف کی چٹان سے ٹکرایا ہے کہ ان کی کوششوں نے کوئی پھل نہ دکھایا کیوں کہ مشرک و ملحد اب بھی اپنی پرانی راہ جا رہے ہیں۔ بت پرست مندروں کو جانے سے نہیں رکتے۔ اور اگر کسی نے انحراف کیا بھی تو وہ ضرور اونچی ذات کا ہندو ہوگا۔ بہ فرضِ محال وہ عیسائی ہو بھی گیا تو یہ مذہب برائے نام ہے اصل میں کچھ نہیں۔ رہ گئے مسلمان تو ان میں نام نہاد عیسائی بھی نہ ملیں گے کیوں کہ انھیں دوسروں کی بہ نسبت اپنے مذہب سے زیادہ عشق ہے۔

اوپر ہم نے Hindu Patriot کے مضمون کا خلاصہ دیا ہے۔ عیسائی مشنری اپنی تحریک کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں، وہ اس سے ظاہر ہے۔ یہ ایسی خوش خبری ہے جسے پڑھ کر مذہب کے سب شیدائی مطمئن ہوں گے۔ البتہ اس بیان کو مکمل کرنے کے لیے

---

[1] پنجابی ۳ اکتوبر ۷۴ء

یہ بات ضروری ہی جو اگرچہ تحریر میں نہیں آئی لیکن ان پادریوں کے دل میں ضرور ہوگی۔ وہ یہ کہ: ہمارے بلند بانگ خطیبوں کا یہ اکثر اثر ہو رہا ہی کہ بہتیرے انگریز[1] مسلمان ہوتے جا رہے ہیں اور گو دینِ محمدیؐ کے مبلغ ہماری طرح گلی کوچوں میں مذہب کے نسخے بیچتے نہیں پھرتے۔ تاہم یہ نومسلم اپنے نئے ایمان پر اٹل ہیں۔ ہمیں یقین ہی کہ اگر ہندو اخبار کے مضمون میں یہ ٹکڑا جوڑ دیا جائے تو اس کا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔"

ہندو اخبار نے یہ اقتباس اس بیان سے لیا ہی جو نانگ پور کانفرنس کے بعد شائع ہوا تھا اور بالتفصیل (Colonial Church Chronicle) کے اگست سنہ ۱۸۶۷ء نمبر میں چھپا ہی لیکن یہ اقتباس صحت سے بہت دور ہی کیوں کہ تینوں پادریوں کا متفقہ بیان عیسوی تحریک کے لیے ہمت افزا ہی۔ اس وقت ملک میں عیسائیوں کی تعداد سوا دو لاکھ ہی جو مجموعی آبادی کو دیکھتے ہوئے بلا شبہہ بے حقیقت ہی۔ بہرحال ان میں سے ۲۰ نے ایسی قابلیت کا ثبوت دیا کہ پادری بنا دیے گئے۔

مسلمانوں پر اس تحریک کا جو ردِ عمل ہوا ہی، اسے فراموش نہ کرنا چاہیے۔ وہابیوں نے حال ہی میں ایک منظوم دعا شائع کی ہی جو ملک بھر میں مقبول ہو گئی ہی۔ اس میں کہا ہی کہ:

"ہمارے سینوں میں ایمان کی آگ ٹھنڈی پڑ رہی ہی۔ کافروں کا ظلم ہمارے دلوں کو چاک کر رہا ہی۔ اسلام کو ہمیشہ اپنی تلوار کا

[1] یہ مغالطہ تو نہیں لیکن مبالغہ ضرور ہی۔ مؤلف

بھروسا رہا ہو۔ اگر ہمارے اجداد کے ہاتھ میں تلوار نہ ہوتی تو وہ کہاں ہوتے ؟ ہم سب کو ایک دن مرنا ہی ہو تو پھر راہِ خدا پر اپنی جان کیوں نہ قربان کریں۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والوں میں بہت سے بخیریت غازی بن کر لوٹ آتے ہیں اور بہت سے گھر میں پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے ہیں۔ موت کا وقت سب کے لیے معین ہو اس لیے تن آسانی اور کاہلی کو چھوڑو، اٹھو اور ایمان کے لیے لڑو۔

اللہ ہند میں اسلام کا بول بالا کر — اس حد تک کہ تیرے سوا اور کسی کا نام باقی نہ رہے[۱]

مسلمانوں کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ کوئی ان کے رسول یا رسالت پر حرف گیر ہو۔ فرنگیوں کی نکتہ چینی کو تو وہ ایک بار برداشت بھی کرلیں گے لیکن کسی ہم وطن کی کیا مجال کہ اس باب میں مُنھ کھولے۔ اس رویے کی وجہ سے کبھی کبھی بڑے ہنگامے ہو جاتے ہیں اور پولیس کی سرگرمی کے باوجود خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں۔ اس قسم کا ایک دنگا بمبئی میں محرم کے زمانے میں ہوا۔ عام طور پر اسی زمانے میں مذہبی فساد ہوا کرتے ہیں۔ اس مرتبہ مسلمانوں کا غضب پارسیوں پر ٹوٹا۔ وجہ یہ تھی کہ انھوں نے Washing Ton Irving کی لکھی ہوئی سیرتِ رسول اللہ کا ترجمہ گجراتی زبان میں چھاپا تھا۔ اس کتاب کے بعض حصوں کو مسلمان قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مسٹر ـــــ نے مسلمانوں کا غصہ ٹھنڈا

[۱] Indian Mail ۲۷ جولائی سنہ ۵۱ء

Indian Mail

Institution

lexandra Native Girl's

411

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ادبی صلاحیت سے یورپ کو روشناس کیا۔ GAY کے قصّوں کا انھوں نے اُردو نظم میں جو ترجمہ کیا ہے، وہ ازحد مقبول ہے۔

بمبئی میں ۳۰ مئی کو ڈاکٹر بھاؤ جی نے اس دنیا کو خیرباد کہا[۱]۔ آثارِ قدیمہ پر انھوں نے جو پُرمغز مقالے لکھے، وہ یورپ اور ہندستان میں یکساں مقبول تھے۔ اصلاح کے بہت بڑے حامی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے قدیم مذہب کو بدلنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ ساری عمر وہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ Victoria and albert Museum کو قائم کرنے میں انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر Bird Wood کی بڑی مدد کی۔ یہ صاحب اب انڈین میوزیم کے نائب نگراں ہیں۔ شاید ہی کسی دوسرے ہندستانی نے اپنے ملک کی اتنی سیر کی ہو، جتنی ڈاکٹر بھاؤ جی نے کی تھی۔ ۱۸۷۳ء میں وہ لارڈ نارتھ بروک کو ایلورا کے نظارے کے لیے لے گئے تھے۔

الہ آباد میں ۱۰ نومبر کو بابو پیاری موہن بنرجی کا سورگ باس ہو گیا۔ یہ تھے تو مجسٹریٹ، لیکن اپنے علم کی وجہ سے سب کو عزیز تھے۔ انھوں نے ہندی زبان میں سنسکرت کی جو گرامر لکھی تھی، وہ بنارس سے شائع ہو چکی ہے۔

یہ مقالہ میں انجیل کی اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ:

"ہم اس وقت شب کی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں لیکن روزِ روشن کے طلوع ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔"

---

[۱] Indian Mail ۲۹ جون ۱۸۷۴ء

ہندستانی زبان و ادب ۱۸۷۵ء میں

اِن دنوں ہندستان کو شہزادۂ ویلز کی میزبانی کا فخر حاصل
ہے۔ انگلستان کی طرح ہندستان میں بھی وہ بے حد مقبول
ہیں اور عرصے سے ان کی آمد کا انتظار تھا۔ اب تو وہ اپنی رعایا
کے دل میں جگہ کر لیں گے اور ان کا یہ سفر حکومتِ برطانیہ کے استحکام
میں اضافہ کرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حکومت کی رواداری اور
تہذیب پروری اس کی مستحق بھی ہے۔

پچھلے سال کا مقالہ شائع ہو چکنے کے بعد مجھے مسٹر کلیمنٹس مارکھم Clements Markham
کی مُرتّبہ رپوٹ بہ عنوان ۱۸۷۲-۷۳ء
میں ہندستان کی اخلاقی و مادّی ترقّی کے اعداد و شمار[1] موصول
ہوئی۔ یہ رپوٹ میرے کرم فرما
سر لوئس مالٹ نے بھیجی ہے۔ یہ ہر سال شائع ہوا کرے گی اور
اس میں ہندستان کے آئین و قوانین، زراعت و حرفت وغیرہ کا
تذکرہ ہوا کرے گا۔ آسانی کے لیے جا بہ جا نقشے بھی دیے ہیں۔

---

[1] East India Progress and Condition, statement exhibiting the moral and material progress of India during the year 1872-73.

افسوس ہے کہ یہ اہم و مفید رپوٹ پہلے دست یاب نہ ہوسکی ورنہ میرا مقالہ زیادہ مکمل ہوجاتا۔ جس محنت سے اس کے لیے اعداد جمع کیے گئے ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اور اگر یہ سلسلہ سال بہ سال جاری رہا تو ہندستان پر مفید ترین معلومات فراہم کرے گا۔

اودھ کے نئے ناظمِ تعلیمات مسٹر جان سی نسفیلڈ JOHN C. NESFIELD نے ۷۴-۱۸۷۳ء میں اودھ کی تعلیمی حالت پر جو رپوٹ شائع کی ہے اس میں ایک ایسی بات کہہ گئے ہیں جس کی تردید کی ضرورت بہ ذاتِ خود صوبے کے چیف کمشنر کو محسوس ہوئی۔ چناں چہ ان کے سکریٹری مسٹر ایچ۔ جے اسپارکس نے سرکاری طور پر جو احتجاج نامہ تحریر کیا ہے، وہ بھی رپوٹ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں کہا ہے کہ "آپ کا خیال ہے کہ اُردو عدالتوں کی زبان نہ رہی تو رفتہ رفتہ فنا ہو جائے گی۔ لیکن اس زبان نے جو قبولِ عام حاصل کر لیا ہے اس کا ثبوت اس کی مطبوعات سے ملتا ہے۔ اس سال تنہا لکھنؤ سے اُردو میں ۲۷۱ کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ہندی میں صرف ۱۴"[1]

اس دلیل کی تردید نہیں ہو سکتی۔ اس کی تصدیق کے لیے

[1] اخبار سر رشتہ تعلیم اودھ (اپریل ۱۸۷۵ء) نے مطبوعات کی تعداد ۳۴۴ بتلائی ہے۔ ان سب میں فارسی و عربی الفاظ کی بہتات ہے اور ہندی کے بول تو خال خال نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بھی کئی ایسے ہوتے ہیں جن کا مفہوم سمجھانے کے لیے حاشیے میں فارسی کے ہم معنی الفاظ دیے جاتے ہیں۔

طلبا کی تعداد کا مقابلہ کیجیے جو اسی سال اودھ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ گو کہ صوبائی حکومت ہندی کی پشت پناہ بنی ہوئی ہے تاہم اس زبان کے پڑھنے والے اُردو خوانوں سے تقریباً چھ ہزار کم تھے۔ دراصل ہندستانی میں اتنی قوت ہے کہ اگر اس میں ضبط کا مادہ پیدا ہو سکے تو وہ کبھی فنا نہ ہوگی۔ بلاغت کی وجہ سے اس میں زور بڑھ جاتا ہے اور ورجل کی شاعری کے متعلق جو بات کہی گئی ہے اس کا اطلاق ہندستانی پر بھی ہو سکتا ہے — "یہ جوش اور یہ روانی بھلا سب کو کب میسر!"

صوبے کے گورنر سر جون اسٹریچی نے اس مسئلے کی تحقیق کی ہے کہ اگر عدالتوں کی زبان اُردو سے بدل کر ہندی کر دیں تو یہ کس حد تک مناسب ہوگا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نیچے طبقے میں ہندی کا زیادہ چلن ہے لیکن جو لوگ ذرا سی شُد بُد بھی حاصل کر لیتے ہیں، وہ اُردو سے ہی واقف ہیں۔ آگرہ و اودھ سے جو اخبار نکلتے ہیں، ان میں سے ۲۵ تو اُردو میں ہوتے ہیں اور صرف ۹ ہندی میں۔ سنہ ۶۳ء میں درسی کتابوں کے علاوہ جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے ۴۵ اُردو میں تھیں اور ۳۵ ہندی میں۔

سر جارج کیمبل George Campbell نے جو ہندستانی (اُردو) کے مخالف ہیں اور جن کی تردید کا فرض مجھے کئی مرتبہ ادا کرنا پڑتا ہے، خود تسلیم کیا ہے کہ: "شمالی و وسطِ ہند (بنگال کے علاوہ) کے رہنے والے ایک ہی نسل کے ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں، یہ زبان ہندستانی ہے۔"[1]

---

[1] Moden India —P. 98

[illegible]

پہنچے تھے مسلمان سپاہی اسی بولی کو اپناتے تھے اور فطری طور پر بیچ کے الفاظ اس میں ملاتے جاتے تھے۔ جیسے جیسے مسلمانوں کی حکومت پھیلتی گئی، ہندو مسلمانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ سیاسی اور تجارتی امور کا یہ تقاضا تھا کہ یہ کچی بولی ایسی شکل اختیار کرے کہ باہمی رابطے کا وسیلہ بن سکے۔ چناں چہ فارسی و عربی اور بھاشا میں بڑے پیمانے پر لین دین ہونے لگا۔ کچھ عرصے بعد یہ بولی جو آگے چل کر اُردو کہلائی، اس لائق ہو گئی کہ ہندو مسلمان سبھی اسے سمجھنے بولنے لگے۔ حلقوں کا یہ اثر ہونا ہی تھا کہ بھاشا میں ترکی، فارسی و عربی کے الفاظ کی تعداد بڑھتی جائے اور اسی نسبت سے خالص بھاشا کا اثر کم ہو جائے۔ رفتہ رفتہ اس انگھڑ بولی کی ایسی تراش خراش ہوئی اور اس نے اپنا جوبن نکالا کہ ہندستانی زبانوں کی ملکہ بن گئی اور پرانی بھاشا نے ایسی مات کھائی کہ برج کی گلیوں کی جوگن بن کر رہ گئی اور اسی وجہ سے برج بھاشا کہلائی۔

شروع سے ہی اُردو کو بڑا رواج ملا پھر بھی بہت سے لوگ اس کے استعمال سے دامن بچاتے رہے اور فوجیوں کے علاوہ کوئی اس کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ کچھ کا بیان ہے کہ اس کا سکہ اکبر کے عہد میں بیٹھا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہوا۔ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُردو کو ایرانیوں نے جنم دیا۔ لیکن اس میں زیادہ اصلیت نہیں کیوں کہ مسلمانوں کی فوجوں میں ایرانیوں کے علاوہ دوسرے بھی تو تھے۔ یہ سچ ہے کہ نئی زبان

ترجموں کے ذریعے اُردو کو اپنی تہذیب اور ترقی کا موقع ملا۔ ہندستان کا کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں یہ زبان بولی یا سمجھی نہ جاتی ہو۔ اس دن کے آنے میں دیر نہیں جب اُردو ہمارے ملک کی قومی زبان بن جائے گی اور مختلف عناصر میں یک جہتی پیدا کرے گی۔ اُردو کو جو فوقیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔ ایک تو یہ کہ زیادہ پُرانی نہ ہونے کی وجہ سے وہ قدامت پرست نہیں اور مغربی خیالات کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہندی سے زیادہ رکھتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ گو کہ مسلمان حاکم سو فی صدی ترقی یافتہ تمدّن کے علم بردار نہ تھے لیکن بہر حال ہندو تمدّن سے وہ آگے تھے۔ وہ توحید پرست بھی تھے اور اس لحاظ سے عیسائیوں سے ان کا میل جول زیادہ آسان تھا۔ عرب یونانیوں کے جانشین تھے اور عرصے تک یورپ میں علم جدید کا چراغ انھوں نے روشن رکھا۔ یہی روشنی انھوں نے ایران میں پھیلائی اور اس کی ایک کرن مغلوں کے ساتھ ہندستان میں آئی۔

انھوں نے جس اُردو کو پروان چڑھایا وہ ہندستان کی قدیم و جدید تاریخ کے عناصر کی حامل ہے۔ عربی و فارسی کے سرمایے سے اس نے اس ملک کو روشناس کرایا۔ اس کے برعکس ہندی کسی نئے اثر کی متحمل نہیں۔ وہ ایک ایسے ماضی کی یادگار ہے جو ہمیشہ کے لیے بیت چکا اور کبھی زندہ نہ ہوگا۔ خواہ یہ ماضی کتنا ہی شان دار کیوں نہ ہو۔ فاتحوں نے اس زبان کو ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا اور صدیوں سے اس نے ہر طرف اپنا گھر بنا لیا۔ ہماری آنکھوں کے

سامنے یہ زبان ترقی کے زینوں پر چڑھ رہی ہو اور سندی ہرگز اس کے مرتبے کو نہیں پہنچتی کیوں کہ اسے بہت کم لوگ لکھتے پڑھتے ہیں۔ اُردو کے رواج کی راہ میں رُکاوٹ ڈالنا ہر لحاظ سے بے کار ہوگا۔ پانی کا دھارا مصنوعی بندھنوں سے نہیں رُک سکتا وہ ان کے سر سے گزر کر اپنی راہ بناتا ہو۔ ہوشیار وہ ہو جو دھارے کی راہ میں نہیں آتا بلکہ اس کی رَو کو ایک حد کے اندر رکھتا ہو۔"

رجعت پسندوں کی جدوجہد کے باوجود حکومت نے یہ عقل مندی کی کہ انڈین سول سروس کے امیدواروں کے لیے ہندستانی جاننے کو لازمی قرار دیا اور انگلستان کی یونی ورسٹیوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام کیا۔ پروفیسر مونیر ولیمس Monier Williams کی رائے ہو کہ آکسفورڈ میں ایک انڈین انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جو وہی فرائض انجام دے جو ہیلری بری Hailery Bury کا ادارہ انجام دیتا تھا۔ سب کو اس ادارے کے بند ہو جانے کا افسوس ہو۔ پروفیسر موصوف شہزادۂ ویلز کے ساتھ ہندستان گئے ہیں تاکہ اپنی اسکیم کے لیے مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کیمبرج میں ہندستانی زبانوں کا ایک خاص نصاب Indian-Languages Tripos پہلے سے موجود ہو۔

حال ہی میں رائل انڈین انجینرنگ کالج Royal Indian Engineering College میں سالانہ تقسیمِ انعام کا جلسہ ہوا جس کی صدارت وزیرِ ہند لارڈ سیلسبری کر رہے تھے۔ اس موقع پر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جب سے بہار میں محکمۂ تعلیمات کی نئی تنظیم ہوئی ہی، اسکولوں میں
ہندی اور اُردو دونوں کے اُستاد مقرر کر دیے گئے ہیں حالاں کہ
طلبا کی بہت بڑی اکثریت اُردو پڑھتی ہی اور ہندی کے رسیا ڈھونڈے
نہیں ملتے۔ ہندستانی اُردو سے صرف اسی لیے محبت نہیں کرتے کہ یہ
ان کی مادری زبان ہی بلکہ اس لیے بھی کہ اسے جاننا گویا ترقی اور
شرافت کی سند لینا ہی اور یہ ایسی سند ہی جو ہندی سے نہیں
مل سکتی۔ لہٰذا حکومتِ وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہی کہ ہر طرح اس زبان
کی ہمت افزائی کرے چہ جائے کہ اسے نقصان پہنچا کر ہندی کی
بے جا حمایت کی جائے۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوششیں
بالکل بے سود ہیں کیوں کہ وہ رعایا کی مرضی اور ضرورت دونوں کے خلاف ہیں۔
اگر اس مسئلے کے سیاسی پہلو کو لیجیے تو ہندو مسلمانوں میں اشتراک بڑھانے والی جتنی
باتیں ہیں اُن سب کی مدد کرنی چاہیے۔ صدیوں سے دونوں قوموں کی زبان ایک
ہی۔ اگر اسے زندہ رہنے دیا جائے تو دونوں قوموں میں جذبات
و خیالات کی ہم آہنگی ہونی لازمی ہی۔ جب دو آدمیوں کی دوستی کا
ذکر کرنا ہو تو اُنھیں ہم زبان و ہم کلام کہا جاتا ہی۔ اگر اب مسلمانوں
کو ہندی پڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا اور ہندوؤں کو پھر دورِ جہالت
کی طرف جانا پڑا تو دونوں کی پُرانی عداوت از سرِ نو شروع
ہو جائے گی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ پڑھنے والے تو اُردو
کی طرف راغب ہیں لیکن حکومت خواہ مخواہ ان کے سر پر ایک
نئی زبان تھوپ رہی ہی؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ کے مُنھ
میں زبردستی (؟) ایسا کھانا ٹھونسا جائے جسے طبیعت قبول نہ کرتی ہو۔

حکومت کا یہ فیصلہ کہ ہر ضلع کے باشندوں کو زبان کے انتخاب کی آزادی ہی، سراسر غلط ہی۔ یہ طریقہ تو مینارِ بابل تعمیر کرنے والوں کا ہی۔ اس طرح ہر ضلع اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے گا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اور ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی پڑھے لکھّوں اور اَن پڑھوں کی بولیوں میں فرق ہوتا ہی، تاہم دونوں بلا دقّت ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں۔ پڑھے لکھّوں کی زبان مستند ہوتی ہی کیوں کہ وہ عدالتوں، اخباروں اور کتابوں میں استعمال کی جاتی ہی۔ یہ علم و ادب، حکومت و مجلس کی زبان ہی۔ بول چال کی زبان بولنے سے آتی ہی کیوں کہ مدرسوں میں ادبی زبان کی تعلیم دی جاتی ہی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو پڑھے لکھّوں کی زبان ہی۔ یہ ہمارے ملک کی زبان ہی جس میں اتنی صلاحیت ہی کہ ہر مضمون کا اظہار کر سکے اور تعلیم عامّہ کا واحد ذریعہ بن سکے..... حکومتِ بہار چاہے تو اپنے منصفوں سے ہی پوچھ دیکھے کہ وہ کس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا یہ ضرور ہی کہ کچھ ہٹ دھرموں کی خوش نوٗدی کے لیے گنواروں کی بولی کو رواج دیا جائے، جانی پہچانی کتابوں کو طاق میں رکھ دیا جائے اور ہندی کی ورق گردانی شروع ہو جسے چند پنڈتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھتا۔ لطف یہ ہی کہ اس زبان کو نہ پڑھے لکھّے سمجھتے ہیں اور نہ عوام! آخر صوبہ جاتِ آگرہ و اودھ اور بہار میں کیا فرق ہی۔ پھر جب آگرہ و اودھ کے

[illegible]

عاقل خاں کر رہے تھے۔ جرح کرتے ہوئے عاقل خاں نے پوچھا کہ شریمتی ہندی کیا آپ انگریزوں سے پہلے بہار میں سکونت پزیر تھیں؟ ہندی کے وکیل کو نفی کے سوا کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس پر منصف نے پوچھا کہ اس دعوے کو ثابت کیجیے کہ ہندی کا نفاذ اُردو کی بہ نسبت صوبے کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ منشی گوری پرشاد نے ہندی کی طرف داری میں ایک لمبی کتھا سنائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے اور بولنے میں دقّت پیش آتی ہے۔ اُردو کی طرف سے جواب دیا گیا کہ یہ دلیل سراسر خام ہے کیوں کہ ایک تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی آسانی کو فراموش کیا جائے اور دوسرے یہ کوئی فرقہ وارانہ سوال نہیں کیوں کہ اُردو دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ بہار میں صدیوں سے اس کا چلن ہے اور ہندو مسلمان سبھی اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ پھر اسے چھوڑ کر ہندی کو کیوں اپنایا جائے جب کہ مسلمان اس سے بالکل ناواقف ہیں اور ہندو بھی اس سے کم آشنا ہیں۔ ایک عام فہم زبان پر کسی اجنبی بولی کو ترجیح دینا کج فہمی نہیں تو کیا ہے۔ ہندوؤں کو اس تبدیلی سے کوئی فائدہ ہونے سے رہا کیوں کہ سرکاری ملازمتوں کی اکثریت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب اُردو جانتے ہیں۔ اگر ہندی کماری کے جھلاوے میں حکومت آگئی تو زیادہ تر سرکاری عہدے داروں کو استعفا داخل کرنا ہوگا۔ ابھی پچاس سال پہلے جب سرکاری زبان فارسی تھی۔ عہدے داروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن

جب سے اُردو کو یہ منصب ملا پانسا پلٹ گیا اور سو میں سے نوّے ہندو اور دس مسلمانوں کی اوسط ہو گئی۔ اگر اُردو کی جگہ ہندی کو ملی تو ایک بھی مسلمان ملازم نظر نہ آئے گا اور یہ ایک پوری قوم کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہندو کس غرض سے کر رہے ہیں؟ یہ رعایا کی بہبودی کے لیے نہیں بلکہ چند لوگوں کے تعصب کے تقاضے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس ترکیب سے ہندو مذہب کو فروغ ہوگا اور اگر مسلمانوں کی زبان مٹ گئی تو ان کی ملت بھی منتشر ہو جائے گی۔

اس کے جواب میں منشی گوری پرشاد صرف یہ کہہ سکے کہ میرا مقابل بڑا مقرر ہے۔ اس کی دلیلوں کا جواب میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ غلط ہیں۔ مجھ میں اتنی لیاقت نہیں کہ ان کی تردید کروں لیکن مجھے منصف صاحب کے رحم و کرم کا آسرا ہے۔ ان سے میری درخواست ہے کہ ہندی دیوی کی لاج رکھ لیں۔

منصف نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا: انصاف کو لاگ لپیٹ سے کوئی واسطہ نہیں۔ رحم و کرم کے لیے مندر جانا چاہیے۔ عاقل خاں نے ثابت کر دیا کہ بہار کے لیے اُردو کا رواج از بس مفید ہے چناں چہ ہندی کا دعوا مسترد کیا گیا اور اُردو بہ دستور عدالتی زبان کے منصب پر فائز رہے گی۔

مضمون کو نقل کرتے ہوئے علی گڑھ گزٹ نے اس روّیے کی مذمت کی ہے کہ ایسا اہم مسئلہ طنز و مزاح کا ہدف بنایا جائے

۱۰

اس نے ایک دوسرے مسلمان کے مضمون کا حوالہ دیا ہو جس نے اپنے ہم مذہبوں کو تنبیہ کی ہو کہ ہندو دھرم کو بُرا بھلا نہ کہیں کیوں کہ پھر وہ بھی اسلام پر اعتراض کریں گے اور ساری بحث اپنے موضوع سے ہٹ جائے گی۔ مذہبی رواداری سے سب کو یکساں فائدہ ہوگا۔

اسی سال فروری میں لندن میں ایک جلسہ اس غرض سے ہوا تھا کہ ہندستانی زبانوں بالخصوص اُردو کا رسم الخط بدل کر رومن کر دینے کی تجویز پر غور کرے۔ عرصے سے مشنریوں کی جماعت اور سر چارلس ٹریولین SIR CHARLES TREVALYAN اس خیال کی اشاعت کر رہے ہیں۔ اس مسئلے پر مَیں اپنی رائے پچھلے مقالوں میں ظاہر کر چکا ہوں۔ جلسے میں ڈاکٹر لائٹنر نے انھی باتوں کو دُہرایا۔ مجھے افسوس ہو کہ میرے دوست پادری جیمس لونگ بنگلہ زبان پر ایسے لٹو ہوئے کہ بہت سے مستشرقین کی طرح بلا وجہ اُردو کے مخالف بن بیٹھے۔

گزشتہ سال مَیں نے جن مشاعروں کا ذکر کیا تھا، وہ برابر دھوم دھام سے ہو رہے ہیں اور ان کا انتخاب ایک گُل دستے کی شکل میں شائع ہوتا ہو جس کا نام 'رسالہ' رکھا گیا ہو۔

۱۴ مئی سنہ ۷۲ء کی ایک صحبت میں میجر ہول رائڈ نے فیصلہ کیا تھا کہ جو کتابیں انجمن کے آگے پیش ہوں، ان پر تبصرے کی غرض سے اہلِ نظر اصحاب کی ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ دسمبر میں اس قسم کی کمیٹی بنا دی گئی تھی۔ اب اخبار پنجابی نے لکھا ہو کہ کمیٹی کو فوراً اپنا کام شروع کر دینا چاہیے اور نظم کی کتابوں پر

اہتمام کرنے والوں نے طے کیا ہے کہ آیندہ مشاعرے کی جملہ غزلوں و نظموں کا مجموعہ چھاپ دیا کریں۔

جنوری ۱۸۷۵ء میں انجمن کا مشاعرہ حسبِ معمول دھوم دھام سے ہوا۔ ملک کے بعض رئیس اور امرت سر کے امرا اور لاہور کالج کے متعدد طلبا نے اس میں شرکت کی۔ ابتدا باہر سے آئی ہوئی نظموں سے ہوئی۔ بعدازاں ہماؔ و حقیرؔ کے نوجوان شاگردوں کے آگے شمع آئی جن کی جولانیِ طبع نے محفل کو گرما دیا۔ اس سلسلے میں اخبار انجمن کے ایک اداریہ میں کہا گیا ہے کہ اگر استادوں کے کمال کا پرتو نئی پود پر پڑا تو اس کے توسط سے شاعری کا اعلا ذوق سارے ملک میں عام ہو جائے گا اور اس کا اثر دور رس ہوگا۔ مشاعرے کے بانیوں کے آگے کلچر کی اصلاح کا جو مقصد ہے، اُس کا ایک پہلو اس طرح پورا ہو جائے گا۔

شمع گردش کرتی ہوتی جب آزادؔ، عطاؔ، ہماؔ، رفیقؔ، حقیرؔ، سعیدؔ جیسے پرانے شاعروں کے آگے آتی تو انھوں نے اپنے منجھے ہوئے پیرایۂ اظہار اور سنورے ہوئے تخیل سے سب کو موہ لیا۔ یہ نظمیں اخبار انجمن میں شائع ہونے والی ہیں۔ مارچ کی مجلسوں کے لیے 'تہذیب' کو موضوعِ مشاعرہ قرار دیا گیا۔ جب سے لے کر اب تک کئی مشاعرے ہو چکے ہیں۔

اخبارِ عالم میرٹھ نے ۱۲ اگست کی اشاعت میں لکھا ہے کہ مشاعروں میں صرف شعرخوانی ہی نہ ہونی چاہیے بلکہ نثر اور صفائیِ زبان کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ فرانس اور اسپین کی

اکیڈمی Academic کی طرح مبتذل الفاظ و محاوروں کے اخراج کا کام انجمن کو اپنے ذمے لینا چاہیے۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان مشاعروں کے منتظمین کا مقصد رفتہ رفتہ ہندستانی ادب پر مغربیت کی خول چڑھانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں پر مغربی رنگ گہرا رچا ہوا ہے۔ لیکن ملکی ادب کو اس کے اصلی ماحول سے نکال کر مغربی ادب کا دُم چھلا بنانے کی کوشش ہرگز مستحسن نہیں۔ اس ضمن میں علی گڑھ سائنٹفک گزٹ[۱] کا حسبِ ذیل مضمون دلچسپی سے خالی نہیں:

"ہمیشہ ہمیں اس کی دُھن رہی کہ ہماری شاعری فطرت سے روشناس ہو اور اپنی مُراد برآتے دیکھ کر ہمیں انتہائی مسرت ہوتی ہے۔ تا ایں دم ہماری شاعری کا دائرہ محدود تھا۔ اس میں عشقیہ غزلوں، واسوخت قصیدوں، قطعوں اور خیالی مثنویوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ان اصنافِ سخن کو یک قلم مسترد کر دینا چاہیے بہرحال ان کے بعض پہلو اچھے بھی ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ شاعری یہیں تک محدود کیوں رکھی گئی۔ مناظرِ قدرت و حقائقِ فطرت پر تو کسی کی نظر ہی نہیں گئی۔ ایک سی بحریں اور ایک سے قافیے، لُطف یہ ہے کہ شاعر ان ضمنی امور میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ اسی کو روحِ سخن گردانتے تھے۔ نظمِ معرّا کی طرف دھیان جانا تو دور رہا کسی کو اس کی جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی[۲]۔ اس حد بندی کی

[۱] ۱۹ فروری ۱۸۷۵ء

[۲] حاشیہ صفحہ ۵۴۰ پر ملاحظہ کیجیے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

کو اس کی توفیق نہ ہوتی تھی کہ فطرت کے مطالعے سے حقیقت کا درس لیتے۔ اگر ہمارے شاعر اب بھی قدرت کے نگارخانے کی طرف جائیں اور ملٹن و شیکسپیر جیسے شاعروں کا مطالعہ کریں اور وہ محض عشق و حسن پر تکیہ نہ کرکے زندگی کے مسائل کی طرف رجوع کریں تو ہمارے ادب کا مستقبل کس قدر شان دار ہو جاتے! پھر ایک دن ہماری قوم میں بھی ملٹن اور شیکسپیر کے ہم سر پیدا ہونے لگیں گے"۔

اگرچہ اب دلّی نہ دیس کی راج دھانی ہے اور نہ صوبے میں شہر کی حیثیت سے اسے کوئی خاص مرتبہ حاصل ہے تاہم اُردو زبان کا اب بھی بڑا مرکز ہے۔ اس لحاظ سے لکھنؤ بہرحال اس پر فوقیت رکھتا ہے کیوں کہ گزشتہ صدی کے اواخر میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ بہت سے سخن سنج اور اہلِ قلم شاہِ اودھ کی پناہ میں چلے آئے تھے۔ ان کے اجتماع نے لکھنؤ کو ریختہ کا مسکن بنا دیا۔ چناں چہ لکھنؤ والوں کو زُعم ہے کہ ان کی زبان دلّی سے زیادہ نکھری ہوئی ہے۔ اودھ اخبار نے جو لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شیرِ قالین کو جنگل کے شیر سے کیا واسطہ۔ دلّی کو جدت میں کمال ہے تو لکھنؤ کو نقل میں۔ لکھنؤ کی بولی دلّی کی اُردوے معلّٰی کا چربہ ہے۔ میر تقی، سودا اور حسن ان تین شاعروں نے اُردو زبان کو نیا روپ دیا اور یہ تینوں دلّی سے آئے تھے۔ زمانۂ حال کے اکثر ممتاز لکھنوی شعرا کو دلّی سے تعلق ہے۔ اس کے بعد اودھ اخبار مثالیں

دے دے کر ثابت کرتا ہو کہ لکھنؤ کا محاورہ دلّی کے روزمرہ سے پھیکا ہو۔

خیر لکھنؤ تو دلّی کا رقیب ہو لیکن اور بھی ایسے شہر ہیں جن کے شاعر دلّی کے اُستادوں کے ہم چشم ہیں۔ زکی مرادآبادی، آتش و اختر (ڈھاکہ) احمد (سکندرہ)، اخگر اٹاوی، ارمان لکھنوی، آرزو اکبرآبادی، آزاد حیدرآبادی، افسوس (ترن؟)، عماد فرخ آبادی، آمیر گوالیاری، سالک عظیم آبادی وغیرہ مانے ہوئے اُستاد ہیں۔ اودھ اخبار نے دلّی کی اُردو کی مثال ایک دریا سے دی ہو جس کا سیلاب پانی کو ہر طرف پھیلا دیتا ہو۔ یہ اثر شہر شہر اور گانو گانو پہنچ گیا ہو جس کی وجہ سے شاعر برساتی کیڑوں کی طرح عام ہوگئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کی طبع زاد ذہانت میں شبہ نہیں۔ چناں چہ اُردو کا کوئی اخبار شعر و شاعری سے خالی نہیں اور اس کی ہر اشاعت میں پانچ دس اچھے بند تو نظر آ ہی جاتے ہیں[۵]۔

۱۸۱۷ء کا ذکر ہو کہ موسیے لانگلے LANGLES کے قابلِ قدر کتب خانے میں ہندستانی کی کتابیں پہلے پہل میرے ہاتھ لگیں۔ ان میں اُردو نثر کی اعلا تصنیف "آرائشِ محفل" مصنفہ افسوس بھی تھی۔ لانگلے کو مشرق سے جو محبت تھی، زمانے نے اس کی داد نہ دی۔ انقلابِ فرانس کے ہنگامہ پرور دور میں بھی وہ بڑے شوق سے ایشیائی زبانیں پڑھتا پڑھاتا رہا اور انقلابی حکومت کو زندہ مشرقی زبانوں کا مدرسہ قائم کرنے پر

[۵] اودھ اخبار ۶، و ۸ اگست اور ۱۰ ستمبر ۱۸۷۵ء

آمادہ کیا۔ اس اسکول کا وہ پہلا ناظم اور فارسی کا پروفیسر تھا۔ اس کا معاون شیزی (CHEZY) تھا جس نے فرانس میں سنسکرت کا شوق پیدا کیا۔ لانگلے کی علمیت مسلّم ہے۔ اس پر صرف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ناشروں کی خوش نودی کے لیے کبھی کبھی صحت کا دامن چھوڑ دیتا تھا۔ وہ میرا اُستاد تھا۔ اس کی نیز یونی ورسٹی کے دیگر ماہرینِ مشرقیات کی رہنمائی سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا۔

مسٹر ایف۔ ایس گراؤز F. S. Growse کی اُردو دشمنی کا رونا میں کئی بار رو چکا ہوں۔ بارے انھیں بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندی لکھنے والوں سے شکایت کریں کہ وہ عام فہم اُردو و فارسی الفاظ کو ترک کر کے دقیق سنسکرت کا استعمال کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جسے یہ لوگ ہندی کہتے ہیں وہ اُردو کی ہی مسخ شدہ شکل ہے جس میں اسم وصفت کو سنسکرت کا رُوپ دے دیا جاتا ہے۔ مسٹر گراؤز نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندی والے اپنے ملک کی آب و ہوا کا خیال نہیں رکھتے مثلاً کسی کتاب میں گرمی کی صبح کی تعریف لہک لہک کر کی گئی ہے۔ ہندستان جیسے گرم ملک میں یہ بکواس مضحکہ خیز سمجھی جائے گی۔ موصوف کو یہ بھی ناپسند ہے کہ یورپین ناموں کو اُلٹا سیدھا ہندستانی خط میں اس طرح لکھ دیا جاتا ہے کہ اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ خود مجھے بھی یہ دقت پیش آتی ہے۔ ایسا یورپین نام جو میرا جانا پہچانا ہے ملکی اخباروں میں چھپ کر بالکل ناآشنا معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر گراؤز کی یہ شکایت بھی بالکل بجا ہے کہ بسا اوقات یورپین الفاظ کا ترجمہ تعصب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مثلاً تاریخ انگلستان کے ایک خلاصے میں Protestantism
کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ست دھرم اور Catholicism کا ترجمہ
کیا ہے۔ یورپ کا جھوٹا مت!

ہم نے اپنی کتاب 'ہندستانی ادب کی تاریخ' کے دیباچے میں جن تذکروں کا نام گنایا ہے، ان میں ایک اضافے کی ضرورت ہے۔ میری مراد لکشمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کی تصنیف "گلِ رعنا" سے ہے جو ۱۷۶۷-۶۸ء میں لکھی گئی۔ ملّا فیروز کے کتب خانے میں اس تذکرے کے دو نسخے تھے۔ اس میں ملک کے تمام ہندو مسلمان شاعروں کی فہرست کلام کے نمونوں کے ساتھ دی گئی ہے۔

محمد منظور صاحب جو دیوانِ ولی (مطبوعہ قاضی ابراہیم و نورالدین در ۱۸۴۳ء) کو عجیب وغریب پیرایے میں مرتب کر چکے ہیں اعلان فرماتے ہیں کہ وہ ہندستان کے جملہ شعرا کا تذکرہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دیوانِ ولی کے دیباچے میں انھوں نے اپنی کارگزاری کا خاکہ بھی شامل کیا ہے۔ شاعروں کو انھوں نے پانچ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان حضرات کی ایسی بہتات ہے کہ اکیلے پنجاب سے ۴۸، کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں چودہ کا شمار استادوں میں کیا جاتا ہے۔ سولہ دوسرے اور ۲۷ تیسرے درجے کے، باقی پھسڈی ہیں۔ ان میں سے کئی کا ذکر ہم نے انجمن لاہور کے مشاعروں کے بیان میں کیا ہے۔

نئی کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان میں سے ایک کا نام 'نظم الممالک' ہے جو دراصل ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے حکومت پٹیالہ

کی فرمایش پر مولوی اسمٰعیل علی گڑھی نے اسے لکھنؤ سے چھپوایا ہی۔ انجمن عرب سرائے کے رسالے میں الطاف حسین نے اس اہم کتاب پر ایک طویل مضمون قلم بند کیا ہی جسے سائنٹفک گزٹ نے نقل کیا ہی۔

تاریخ الاولیا کی اشاعت پر پنجابی نے یہ شذرہ تحریر کیا ہی:

"جنھیں ملّتِ اسلامیہ کے اولیا و علماے کرام سے عقیدت ہی انھیں مژدہ ہو کہ انبیا و اولیا کی مکمل تاریخ زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہی۔ اس کی پہلی جلد جو شائع ہو چکی ہی حضرت آدمؑ سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کے نبیوں، پیغمبروں اور ولیوں کے حالات کی حامل ہی۔ یہ مبسوط مقدّمے کے علاوہ دو ابواب پر مشتمل ہی۔ مقدّمے میں تصوّف کی ۲۱ برکتوں کے علاوہ چاروں مذہبی سلسلوں کے بانیوں کی سیرت تحریر ہی۔ پہلے باب میں نو فصلیں ہیں جن میں پیغمبروں کے سوا آں حضرتؐ، صحابہ کرام، خلفاے راشدین اور بارہ اماموں کے حالات ہیں۔ دوسرے باب میں قادریہ، چشتیہ، سہروردی اور نقش بندی سلسلوں کی تاریخ ہی۔ ساتھ ہی ساتھ مشہور مفسّر و محدّث، علما و صوفیوں کا بھی ذکر ہی۔

مطبوعہ جلد میں ایک ہزار بزرگوں کی زندگی کے احوال جمع کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں پانچویں صدی سے ہزارویں صدی ہجری تک کی مخصوص اسلامی شخصیتوں کی تاریخ ہو گی۔ اور آخری جلد میں اُس زمانے سے اس وقت تک کے اولیا و علما کے حالات ہوں گے۔

اس بے مثل تاریخ کو بمبئی کے سید امام الدین احمد گلشن آبادی ترتیب دے رہے ہیں۔

سلہ ۱۳ فروری ۱۸۷۵ء

عربی کتاب احیاء العلوم کا ترجمہ اُردو میں مذاق العارفین کے نام سے چھپا ہے۔

ایک اخبار نے لکھا ہے کہ میرزا فتح محمد بیگ[1] دینِ اسلام پر ایک رسالہ تیار کر رہے ہیں جو اُن لوگوں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا جو اوہام کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

منشی محمد ذکاء اللہ خاں کی تاریخ ہندستان پر پہلے بھی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب اس کی دوسری جلد شائع ہوئی ہے۔ الطاف حسین دہلوی نے علی گڑھ اخبار[2] میں اس کے متعلق ایک دل چسپ مضمون لکھا ہے: "پہلی جلد میں ہندو عہد کی داستان تھی، پیشِ نظر کتاب مسلم عہد کے لیے وقف ہے اور تیسرے میں برطانوی دور کی تاریخ ہوگی۔ اب تک اُردو زبان میں ہندستان کی کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ مغربی مورّخوں کی محنت نے ہندو عہد پر سے تاریکی کا پردہ اٹھا دیا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق فارسی میں اور انگریزوں کے بارے میں انگریزی میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ مؤلف نے ان سب کا مطالعہ کر کے یہ تاریخ لکھی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے وہ غیر ضروری چیزیں چھانٹ دی ہیں جو عام طور پر تاریخ و فسانے کی تمیز مٹا دیتی ہیں۔ واقعات کی روشنی میں جو بات کھری نہیں اُتری، اسے سختی سے قلم زد کر دیا ہے۔ مثلاً بازار کی افواہوں، نجومیوں کی کہانیوں اور شاعروں کے قصیدوں کے لیے ان کے

[1] ان کا ذکر میرے مقالے بابت سنہ ۷۴ء میں آچکا ہے۔
[2] ۱۸ جون سنہ ۷۵ء

ہاں کوئی جگہ نہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ کی رسومات، میلے ٹھیلوں کا حال، شکار کی تفصیل ایسی سب فضول چیزوں کو ترک کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ منشی ذکاءاللہ کا طریقۂ کار یکسر مغربی ہے اور اس لحاظ سے وہ ایشیائی مورخوں میں سب سے آگے ہیں۔ ہر دورِ حکومت کے بیان میں انھوں نے اپنی ذاتی رائے کو الگ رکھ کر انصاف پروری سے کام لیا ہے اور تعصب کو کہیں پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اندازِ تحریر سادہ اور دلچسپ ہے۔ اس ضخیم جلد کو کہیں سے کھول کر پڑھیے، یہی خوبی نظر آئے گی۔ مؤلف نے کسی مورخ کا اثر قبول نہیں کیا، اپنے ضمیر کو رہنما بنایا ہے۔ ہندستانی حکمرانوں کے تذکرے میں مغربی نقادوں کی ستایش یا تنقیص کی کوئی پروا نہیں کی۔ علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی نے الفنسٹن صاحب کی تاریخ کا ترجمہ شائع کیا ہے لیکن منشی ذکاءاللہ کے کارنامے سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ الفنسٹن نے زیادہ تر ملکی مورخین سے استفادہ کیا ہے اس لیے اردو میں ترجمہ در ترجمہ کا نقص موجود ہے۔ علاوہ بریں الفنسٹن کی تاریخ نہ تو اتنی مفصل ہے جتنی پیشِ نظر کتاب اور نہ وہ تعصب سے خالی ہے۔ بس ہمیں اس عالم کا احترام کرنا چاہیے جس نے انتہائی عرق ریزی کے بعد ہمارے وطن کی مکمل تاریخ تیار کی اور ایک ایسی کمی پوری کی جو ہمارے ادب کی بے مائگی پر نکتہ چیں تھی۔"

شاہ زادہ نصیر الدین حیدر دہلوی کی تاریخ پنجاب پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے[1] ساتھ ہی ساتھ انھوں نے تذکرۃ الآفاق کے

[1] پنجابی ۲۱ نومبر ۱۸۶۷ء

[illegible]

پیش کی ہی۔ دراصل یہ خطوط کا سلسلہ ہی جس کے پیرائے میں عورتوں کو صحت کے ساتھ اظہارِ خیال کا اسلوب بتلایا گیا ہی۔ شروع میں حفظِ مراتب کے لحاظ سے بڑی بوڑھیوں کو تخاطب ہی پھر بہنوں اور سہیلیوں سے گفتگو ہی اور آخر میں مغلانیوں یا نوکرانیوں کے نام فرمان ہیں[1]۔

راجا شیو پرشاد ستارۂ ہند نے 'اُردو گرامر' کے نام سے اُردو میں اور 'ہندی گرامر' کے نام سے ہندی میں دو کتابیں شائع کی ہیں۔ ہر ایک کی پانچ پانچ ہزار جلدیں چھاپی گئی ہیں۔ دونوں میں اس قدر یکسانی ہی کہ مسٹر جان بیمس John Beamese کا یہ قول یاد آجاتا ہی: "جو اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں بتلاتا ہی وہ لسانیات سے بالکل بے بہرہ ہی[2]"۔ مسٹر گراؤز F. S. Growse نے بھی کہا ہی کہ: "اس مصنوعی تفریق کا باب فوراً بند ہو جانا چاہیے اور بول چال کی زبان کو ہندستانی کہہ کر ملک کی واحد قومی زبان تسلیم کر لینا چاہیے"۔ بدنصیبی سے اس کا زیادہ امکان نہیں کم از کم رسم الخط کے معاملے میں تو اتفاقِ رائے کی امید نہیں کیونکہ اُردو داہنے سے بائیں لکھی جاتی ہی اور ہندی بائیں سے داہنے۔ اُردو خط ہندوؤں کو نہیں بھاتا اور مسلمانوں کو دیوناگری پسند نہیں۔ دونوں کے پیرایۂ اظہار میں بھی فرق ہی لیکن دونوں کی گرامر ایک ہی اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، دراصل یہ دونوں

[1] علی گڑھ اخبار ۱۱ جون سنہ ۷۵ء

[2] Comparative Grammer of the Modern Aryan Languages جلد اوّل صفحہ ۴۲

ایک ہی زبان یعنی ہندستانی کی دو شاخیں ہیں۔ بہرحال ستارۂ ہند کی یہ کاوش مبارک باد کی مستحق ہو۔ ایک دوسری قابلِ ذکر کتاب کا نام 'مفید الاطفال' ہو۔ مصنف منشی وزیر سنگھ ہیں اور یہ از سرِ نو دہلی سے اسی سال چھپی ہو۔ اسے مختصر سی انگریزی اُردو لغت سمجھنی چاہیے۔ لُطف یہ کہ بحرِ خفیف میں سارا مضمون نظم کیا گیا ہو اور صرف ایسے الفاظ چُنے گئے ہیں جن کی نشست ہو سکے۔ مثلاً:

رحم Mercy (مرسی) ہو اور فضل Grace (گریس)

پہاڑی Hill ہو اور جاے Place (پلیس)

ظاہر ہو کہ مصنف نے بڑی مغز پاشی کے بعد یہ کتاب تیار کی ہوگی۔ دہلی کالج کے پرنسپل نے اس کی بڑی تعریف کی ہو اور انگریزی سیکھنے میں اسکول کے طلبا کو اس سے کافی مدد ملتی ہو۔

صاحب زادہ محمد عبید اللہ خاں خلف نواب محمد وزیر خاں کا سفرنامہ حال ہی میں شائع ہوا ہو۔ موصوف والیِ ٹونک کے چچا ہیں۔ پنجابی نے ۱۹ جون کی اشاعت میں اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا ہو۔ سفرنامے میں کوئی خاص بات نہیں کیوں کہ یہ پانی پت، بنارس، بریلی، مرادآباد، علی گڑھ اور آگرہ کی سیر کا تذکرہ ہو اور یہ سیر صرف ۲۵ روز میں ختم ہو گئی۔ یہ سچ ہو کہ اس سیر کا واحد مقصد تاریخی مقامات کی دید اور وہاں کے بڑے بڑے لوگوں کی ملاقات تھا۔ صاحب زادے نے سفر کے دوران میں ضرورت مند اداروں کو نوازا، خاص طور پر مدرسۃ العلوم کی مالی مدد کی۔ مسلمانوں کو عام طور پر اس مدرسے سے ہم دردی ہو۔

ایشیا کی ریاستیں اپنی اندھیر نگری کے لیے بہت بدنام ہیں۔

[illegible]

دبدبۂ سراجِ غیب۔ از میر شاہد علی۔ یہ جوتش کی کتاب ہے۔
مصباح الحیات۔ مذہبی کتاب۔ از میر حیات میسوری
مصباح المجالس۔ سیرتِ نبوی۔ از قاضی غلام علی۔ حجم ۲۹۶ صفحات
اعجازِ احمدی۔ سیرتِ نبوی۔ از غلام اصغر شیدا
قصۂ فغفورِ چین۔
لیلیٰ مجنوں کے دو نئے ایڈیشن۔ ایک خلیفہ محمد کا جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرا سید فضل کا جو ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۸۷۴ء میں بمبئی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی فہرست میں دیوانِ ولی کا وہ ایڈیشن بھی ہے جس کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس کا ایک نسخہ مسٹر چیٹفیلڈ نے از راہِ عنایت مجھے بھیجا ہے۔ موصوف صوبۂ بمبئی میں ناظمِ تعلیمات کی خدمت پر فائز ہیں۔

اودھ اخبار نے جن نئی اُردو کتابوں کا نام چھاپا ہے ان میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔
عجائب القصص۔ اس میں تمام پیغمبروں کے حالات میں سے دلچسپ ترین واقعات کا انتخاب ہے۔
طلسمِ ہند۔ ملک کے سلاطین اور راجگان کا تذکرہ۔
تاویلِ منام۔ ایک عربی کتاب کا ترجمہ۔ مترجم بشارت علی خاں۔
مہابھارت کے ہندی ترجمے کی طبع ثانی چار جلدوں میں۔ پہلا ایڈیشن کلکتہ میں ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔

مدیر پنجابی نے اعلان کیا ہے[1] کہ وہ پروفیسر آزاد کی مثنویوں کا

[1] ۲۶ دسمبر ۱۸۷۳ء

انتخاب 'اُستاد خداداد' کے نام سے نکال رہے ہیں۔

روہیل کھنڈ کی ادبی انجمن کی سرپرستی میں شاستری تاراچند اختر نے "استری دھرم سنگرہ" نامی کتاب بریلی میں شائع کی ہی۔ اس میں ہندو عورتوں سے متعلق قوانین کا انتخاب ہی۔

اس زمانے میں ہندی کی جو سب سے اہم کتاب نکلی وہ بلاشبہ "یجور وید" کا ترجمہ ہی۔ اسے علی گڑھ کے ٹھاکر گوری پرشاد سنگھ نے چھاپا ہی۔ یہ وہی ہیں جو منگل سماچار نامی اخبار ہندی اُردو دونوں زبانوں میں نکالتے ہیں۔

اودھ کے محکمۂ تعلیم کی فرمایش پر حال میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے حسبِ ذیل کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں:۔

واقعہ نگارِ انگلستان۔ Collier's British Empire کا ترجمہ از مولوی ابوالحسن۔

عطر مجموعہ۔ Urdu Poetical Reader کی شرح۔

گلشنِ فیض۔ راجا بھوج کی کہانی کا اُردو ترجمہ۔ از رام رتن لال

بہارستانِ اشعار۔ رائے کشن کمار مرادآباد کے اُردو کلام کا مجموعہ جس کی اخبارِ عالم نے بڑی تعریف کی ہی۔

بنارس کالج کے پروفیسر لکشمی شنکر مسرا نے سائنٹفک مضامین پر جو مقالے پڑھے تھے، ان کا ترجمہ ہندی میں چھپ گیا ہی۔

ہندستانی میں عیسائی پادریوں نے جو مفید کتابیں اور رسالے تیار کیے ہیں، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

مدراس کے مولا بخش ہندستانی کے علاوہ چھ زبانوں (تامل،

تیلگو، کنٹری، ملاباری، گجراتی اور مرہٹی) کے گیت گا سکتے ہیں۔ انھوں نے موسیقی کے چار بنیادی عناصر — تال، سُر اور راگ تان — پر ایک بصیرت افروز کتاب لکھی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ قدیم موسیقی کے اصولوں سے لوگ آشنا ہوں اور ان کی بے توجہی سے یہ نادر فن فنا نہ ہو جائے[1]۔

ڈاکٹر فیلن کی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے۔ اس طرح کے ۴۸ صفحات کے کوئی ۲۵ حصے ہوں گے۔ اتنے بڑے کام کو اس خیر و خوبی سے انجام دے کر فاضل لغت نگار نے اپنی لگن اور علم پرستی کا ثبوت دیا ہے۔

صوبہ جاتِ شمال و مغرب کی حکومت کے مترجم منشی سدا سکھ نے ایک انگریزی اُردو لغت تیار کی ہے۔ اس میں ہزار سے زیادہ صفحات ہیں اور الہ آباد میں چھپی ہے[2]۔

پہلے کبھی میں نے الہ آباد کے پادری جے۔ ڈی۔ بیٹ J.D. BATE کا نام لیا تھا جو ایک ہندی لغت تیار کر رہے تھے۔ اب بہت بڑی تقطیع کے آٹھ سو صفحوں پر یہ ڈکشنری بنارس سے نکلی ہے اور موصوف نے ازراہِ کرم مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے۔ ہندی کی اشاعت کے ساتھ اس قسم کی لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی کیونکہ حکومت کی نوازش سے اس زبان نے خوب بال و پر نکالے ہیں۔ اس میں پچاس ہزار الفاظ یا مشتقات ہیں یعنی ٹامسن صاحب کی لکھی ہوئی

[1] پنجابی ۲۶ دسمبر سنہ ۷۴ء

[2] پنجابی ۱۰ جولائی سنہ ۷۵ء

واحد ہندی لغت سے کوئی ۲۵ ہزار زیادہ۔ مسٹر بیٹ بیپٹسٹ مشن سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ امر نہ بھولنا چاہیے کہ یہ مشن ہمیشہ علمی و ادبی کام کرتا رہا ہے۔ پہلے تو اس کے کارکن اُردو کی خدمت کرتے رہے لیکن اس وقت تین فاضل پادری قدیم و جدید ہندی ادب کے مختلف شعبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے اتھرنگٹن صاحب Etherington نے ہندی زبان کی گرامر لکھی ہے۔ کیلاگ صاحب Kellogg اب نہایت وسیع پیمانے پر ادبی و بول چال کی ہندی گرامر تیار کر رہے ہیں۔ مسودے کے بعض حصے میری نظر سے گزرے ہیں اور کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنی قسم کی تنہا کتاب ہے۔ بیٹ صاحب کی لغت کا ذکر تو اوپر آ ہی چکا ہے۔

مسٹر جون بیمس کے گرامر[1] کی دوسری جلد بھی نکل آئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقابلی لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ ہمارے زمانے کی اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ ہندیات کے شہرۂ آفاق ماہر ڈاکٹر مرے مچل Murray Mitchell کی سند میرے قول کی تصدیق کرتی ہے[2]۔

مسٹر گراؤز نے دو دو سو صفحوں کی دو جلدوں میں متھرا کے ضلع کا حال لکھا ہے۔ متھرا کی اہمیت ہندستان کی تاریخ میں اتنی نہیں جتنی کہ دیومالا میں ہے۔ اس دلچسپ کتاب میں تصویروں اور نقشوں کے

---

[1] Comparative Grammer of the Modern Aryan Languages of India

[2] Indian Antiquary جون ۱۸۷۵ء

علاوہ قدیم سنسکرت وہندی کتابوں کے اقتباس بھی دیے گئے ہیں۔ اتفاق سے ان تین ویدوں کے ایک ہندی خلاصے 'ولیم سار' کا نام آگیا ہے جس کے متعلق اب تک کچھ نہیں سنا گیا تھا۔ ایک ہندو فرقے کے بانی ولبھا چاریہ کے مت سے تعلق رکھنے والی چند نایاب ہندی کتابوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ تلسی داس کی راماین کا جو عمدہ ایڈیشن رام سین نے تیار کیا ہے، اس پر رائے دیتے ہوئے گراؤز صاحب نے کہا ہے کہ والمیک کی سنسکرت راماین اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔[۵۷]

(۳)

ہندستان میں اخبار بینی کا شوق روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے اور یہی حالت رہی تو کچھ عرصے کے بعد بغیر اخبار پڑھے یورپینوں کی طرح ہندستانیوں کا بھی کھانا ہضم نہ ہوگا۔ اس روزافزوں شوق پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک دیسی اخبار شاکی ہے کہ لوگ محض سنسنی خیز خبروں کے شائق ہیں اور سنجیدہ مضامین سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔

ہندستان میں پریس آزاد ہے۔ تاہم حکومت نے حال ہی میں یہ قانون پاس کیا ہے کہ کوئی سرکاری نوکر کسی سیاسی اخبار کا مالک یا ایڈیٹر نہ ہو اور نہ بلا اجازت اس میں مضمون لکھے۔ ہندستانی اخباروں نے اس پابندی کی سخت مخالفت کی ہے کیوں کہ وہ حکومت و رعایا کو باہم 'شیر و شکر' دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر حکومت پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ اگر دوا بھی کڑوی ہو تو اسے تھوک دو!

۵۷ Calcutta Review اکتوبر سنہ ۷۴ء

ان غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے اخباروں کو بڑا نقصان ہوگا کیونکہ خبر رسانی کا کوئی مستند ذریعہ اب ان کے پاس نہیں۔

لاہور کے کمشنر نے ایک اور گل کھلایا۔ انھوں نے حکم صادر کیا کہ کسی اخبار کا ایڈیٹر یا نامہ نگار عدالت کے احاطے میں قدم نہ رکھنے پائے۔ اخبار انجمنِ پنجاب اس فرمان پر سخت برہم ہو لکھتا ہو: "اب تک ہمارا خیال تھا کہ اخباروں کو مراعات دینے سے حکومت کا یہ منشا ہو کہ عوام کو نیک و بد کی خبر ہو سکے اور حکومت و رعایا میں تعلق پیدا ہو سکے لیکن اگر پردہ پوشی کا یہ عالم ہو تو اخبار کیا کر سکتے ہیں؟"[1]

اسی اخبار میں اخبار نویسی پر ۳۰ کالم کا ایک طولانی مضمون دیکھنے میں آیا[2] اور میرٹھ کے اخبار عالم نے بھی اسی موضوع پر دل کی بھڑاس نکالی ہو۔[3] پہلے مضمون میں اخباروں کی اہمیت، اُن کے فرائض اور ان کے لیے آزادی کی ضرورت پر بحث کی گئی ہو۔ بعد ازاں اخبار نویسوں کی صلاحیت پر بہت کچھ کہا گیا ہو اور بتلایا گیا ہو کہ وہ کس طرح عوام کی رہ نمائی کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۳ء کے مقالے میں اس قسم کے مضامین کا خاکہ میں دے چکا ہوں لہٰذا انھیں پھر سے دُہرانا بے کار ہو۔ ہر دو مضمون میں اخبار و اخبار نویس کا اتنا بلند معیار قائم کیا ہو جو اس وقت تو عنقا ہو البتہ اخبار انجمن کے مقالے کے دوسرے حصے میں اُردو کے خاص خاص جریدوں

[1] اخبار انجمن پنجاب ۱۲ فروری ۱۸۵۵ء

[2] اخبار عالم ۱۱ مارچ ۱۸۵۵ء

[3] علی گڑھ سائنٹفک گزٹ بابت ۱۰ ستمبر ۱۸۵۵ء میں بھی اسی قسم کا مضمون دیکھنے میں آیا۔

[illegible]

نیک نیتی مسلّم ہی۔ البتہ اخبار میں کبھی کبھی بے ترتیبی ہوتی ہی اور طرزِ تحریر بھی روکھا پھیکا ہوتا ہی۔

کوہِ نور کو زبان کی غلطیوں کی کبھی پروانہ رہی اور اب تو غلط نویسی کا یہ حال ہی کہ جو طالب علم اسے پڑھے گا، اُردو بھول جائے گا۔ قطع نظر اس سے اخبار کے نامہ نگاروں کا دائرہ وسیع ہی اور اس وجہ سے خبروں کا انتخاب بہت اچھا ہوتا ہی۔ اخبار کے مالک منشی ہرسکھ رائے کو اپنے کام کا بڑا تجربہ ہوگیا ہی۔ ان کے مضامین نہایت کارآمد ہوتے ہیں۔ طرزِ بیان کی بات دوسری ہی۔

اخبارِ عالم میرٹھ کی وقعت میں شبہے کی گنجایش نہیں۔ اس کے ایڈیٹر آزاد خیال، وطن دوست اور اخلاص پرور ہیں۔ البتہ خبریں باسی ہوتی ہیں اور زبان بھی زرا پھیکی ہوتی ہی۔

کشف الاخبار۔ اپنی خبروں کے لیے مشہور ہی کیوں کہ اس کے لیے بمبئی میں بڑی سہولتیں موجود ہیں۔ ایڈیٹر کے قلم میں زور بھی ہی گو کہ وہ اکثر اپنا ذکر کیا کرتے ہیں۔

لارینس گزٹ ہماری زبان کے بہترین اخباروں میں سے ہی لیکن اس کی اشاعت محدود ہی۔

اُردو گائڈ دوسرے درجے کا اخبار ہی۔

کارنامۂ سخن۔ پُرانی لکیر کا فقیر ہوتے ہوے بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ تعجب ہی کہ ایڈیٹر گو کہ مولوی ہی پھر بھی جابجا املا کی غلطیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مجموعی طور پر اچھا اخبار ہی۔

دبدبۂ سکندری سرکاری اخبار ہی۔ اڈے پور کے ایک مضمون نگار

کی وجہ سے اس کی رونق ہی۔ ایڈیٹر کے مضامین بھی بُرے نہیں ہوتے۔

شعلۂ طور کان پور کو اپنی ترتیب اور طرزِ انشا کی وجہ سے امتیاز حاصل ہی۔ یہ سب ایڈیٹر کی قابلیت کا ظہور ہی۔ یہ کمی ضرور ہی کہ وہ جدید علوم سے ناواقف ہیں اس لیے ان کا دائرۂ خیال محدود ہی۔

اُردو دلّی گزٹ کی اشاعت کم نہیں کیوں کہ اسے حکومت کی سرپرستی ملی ہوئی ہی لیکن اس کے لکھنے کا ڈھنگ بے نمک اور پھسپھسا ہوتا ہی۔

آفتابِ پنجاب بھی خوب بِکتا ہی کیوں کہ یہ انوار الشمس کا جانشین اور کوہِ نور کا دُودھ بھائی ہی۔ اپنی رواداری اور خبر رسانی کے لیے مشہور ہی۔

ہندو پرکاش امرت سر کا کوئی پرچہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا اس لیے اس کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی[1]۔

اتالیق پنجاب۔ یہ ہم عصر نہ تو قوم و ملک کا ہم درد ہی اور نہ نئے خیالات کا حامی۔ جب تک اس کی کایا پلٹ نہ ہو اس کا شمار اچھے اخباروں میں نہیں ہوسکتا۔

پٹیالہ اخبار اپنی ریاست کا ترجمان ہی۔ اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ایڈیٹر کی زبان پر سونے کی مُہر لگی ہوتی ہی؟ یہ نہ ہوتا تو ان کا پرچہ ملک کا بھلا کرتا۔

تہذیب الاخلاق مضمون و بیان کے بلند معیار کی وجہ سے قابلِ ستایش ہی۔ یہ اخبار ہر حیثیت سے خرد افروز ہی۔

[1] اخبارِ عالم نے لکھا ہی کہ اس سال جولائی میں یہ اخبار بند ہوگیا

اس مبسوط تبصرے کے بعد اخبار انجمنِ پنجاب لکھتا ہو کہ: "اگر اودھ اخبار کی دل چسپی سائنٹفک گزٹ کی سنجیدگی، نورالابصار کی دردمندی، اخبارِ عالم کی نیک نیتی، پنجابی کی رواداری اور تہذیب الاخلاق کی آزاد خیالی کو یک جا کر دیا جائے تو یہ اخبار نویسی کی معراج ہوگی"۔

موسیے ساں الیر Saint Hilaire نے میرے مقالات پر ریویو کرتے ہوتے بالکل ٹھیک کہا ہو کہ ہندستان میں تہذیبِ جدید کی روزافزوں مقبولیت کا ایک بیّن ثبوت، ہر سال نئے اخباروں کا اجرا ہو اور عجیب بات یہ ہو کہ ہر اخبار کے خریدار نکل آتے ہیں۔ گو کہ حکومت صوبائی زبانوں کی ہمت افزائی میں لگی ہوئی ہو۔ تاہم اس سال بھی ہندستان کے درجنوں نئے اخبار نکل آتے ہیں۔ ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہو:-

احسن الاخبار حیدرآباد دکن سے نکلا ہو۔ اسی نام کا ایک اور جریدہ بریلی سے نکلا کرتا ہو۔

اجمیر اخبار اُردو میں نکلنا شروع ہوا ہو۔

اخبار انجمن ہند کو لاہور یا لکھنؤ کی انجمنوں سے کوئی تعلق نہیں اور اخبار عالم کی رائے تو یہ ہو کہ اس کا ایڈیٹر معمولی صلاحیت کا آدمی ہو اس لیے اس کا اخبار بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اخباروں کا قبلہ گاہ۔ ستمبر میں لاہور سے مولوی فتح الدین کی ادارت میں نکلنے والا تھا۔ اودھ اخبار اس نام سے سخت خفا ہو کیوں کہ اس سے تعلّی کی بو آتی ہو۔

[illegible]

Saunders

[illegible]

کی گئی ہی اور لکھا گیا ہی کہ مسلم اخباروں میں صرف اسلام کے نقطۂ نظر کی اشاعت ہونی چاہیے۔ پنجابی کی رائے ہی کہ اس سے اخباروں کی اشاعت محدود ہو جائے گی۔

مرآۃ الہند جس کا ذکر اودھ اخبار ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں ہی۔

مرقع تہذیب لکھنؤ کی انجمنِ تہذیب کی طرف سے سالِ رواں کے پہلے مہینے سے نکلنے لگا ہی۔ وہ اپنے کو انصاف اور ترقی کا حامی بتاتے ہوئے لکھتا ہی کہ ہم لمبے چوڑے دعوے نہیں کرتے مگر روشن خیالی کی تلقین میں ضرور پیش پیش ہیں۔

رہبرِ ہند اور ہندستان کی عام رائے کا نمونہ منشی نادر علی شاہ سیفی نے لاہور سے یکم اپریل سے نکالا ہی۔ وہ اپنے کو ملک کا مخلص خادم بتاتے ہیں۔

تاج الاخبار رام پور کا سرکاری گزٹ ہی۔ منشی امیر احمد کے صاحب زادے کی ادارت میں نکلتا ہی۔ اودھ اخبار نے اس کی بڑی تعریف کی ہی۔

خیر خواہِ عالم (دہلی) کا ضمیمہ ضیاء الاسلام کے نام سے اب پندرہ روزہ اخبار کی شکل میں نکلنے لگا ہی۔ اسلام پر عیسائی پادری جو اعتراض کیا کرتے ہیں، اس کی تردید کے لیے یہ رسالہ وقف ہی۔ خیر خواہِ عالم بہ ذاتِ خود سیاسی و ادبی پرچہ ہی۔

بڑودہ سے اب تک کوئی اخبار نہ نکلتا تھا۔ نئے مہاراجا مادھوراؤ نے اب یہ کمی پوری کرنے کا ارادہ کیا ہی۔

کالیستھ سماچار کچھ عرصے سے بند تھا۔ اب ایک نئے ایڈیٹر

منشی رام کشن پروفیسر کیننگ کالج کی ادارت میں پھر سے نکلا ہی۔ اس کے پُرانے مدیر منشی گوکل پرشاد رسا تھے[1]

کئی پُرانے اخبار جو ہفتے میں ایک بار چھپا کرتے تھے اب دو دو مرتبہ نکلنے لگے ہیں۔ اُردو زبان کا سب سے مشہور جریدہ اودھ اخبار ہر دوسرے روز نکلنے لگا ہی اور عجب نہیں کہ کچھ عرصے بعد روزنامہ ہی ہو جاتے۔

مسٹر مردوک Murdock نے عیسائیوں کے کئی مذہبی پرچوں کا ذکر کیا ہی[2] ان میں سب سے زیادہ مقبول لدھیانہ کا ہفتے وار نورِ افشاں ہی جسے دو سال پہلے پادری Wherry نے جاری کیا تھا۔ اسی کی توڑ پر دہلی سے ضیاء الاسلام کا اجرا ہوا ہی۔ بچّوں کے لیے خیر خواہ اطفال کے نام سے ماہانہ رسالہ شایع ہو رہا ہی جس کے ہندی ایڈیشن کا نام بال ہتکر ہی۔ لندن مشن کے پادری Budden الموڑہ سے ہندی میگزین نکال رہے ہیں۔ ادھر لکھنؤ سے اُردو اور ہندی دونوں میں "لکھنؤ ٹیمس" چھپ رہا ہی۔ آتالیقِ ہند کو آتالیقِ پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہی۔ پہلا نمبر لاہور سے دسمبر [illegible] میں نکلا تھا۔ اداریے میں کہا گیا ہی کہ اخبار حکومت و رعایا اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو مستحکم تر کرنے کے لیے وقف ہوگا۔ ساتھ ساتھ وہ ان بدعنوانیوں کا قلع قمع بھی کرے گا جو ملک کی ترقی میں حائل ہیں۔

---

[1] اودھ اخبار ۲۲ اگست [illegible]

[2] Conference on Urdu and Hindi literature P. 103 [illegible]

اخبار انجمنِ پنجاب نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہی: "ہم عصر 'اتالیقِ ہند' کا تعارف اپنے ناظرین سے کراتے ہوئے ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہی۔ ہم اس کے ہر نمبر کو غور سے پڑھتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ادارت محنت اور دیانت سے کی جاتی ہی۔ یہ جس اصول پر چل رہا ہی اس پر ہر اخبار کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یعنی حکومت کو صحیح مشورہ دینا، عوام کی خدمت کرنا اور اپنے کو ان کے احساسات کا ترجمان بنانا۔ اتالیقِ ہند اس راستے پر آزادی اور استحکام سے چل رہا ہی۔ اس کے ایڈیٹر سیفی صاحب کا علم و فضل سب پر روشن ہی اور ان کے قلم سے جو کچھ بھی نکلتا ہی، اُسے سرمۂ بصیرت سمجھنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہی کہ ایسے اخبار کا اجرا صوبۂ پنجاب کی خوش قسمتی کا باعث ہوگا اور یہاں اُسے بے قدری کی شکایت نہ ہوگی۔ ملک کے سب جریدوں کو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔"

علی گڑھ اخبار رقم طراز ہی: "ہنوز ہم نے اتالیقِ ہند کا ذکر نہ کیا کیوں کہ اس کی بقا کی طرف سے ہمیں کھٹکا تھا۔ مقامِ مسرت ہی کہ اب اس کی کامیابی ثابت ہوگئی اور اس کی خوش ترتیبی کی طرف سے ہمیں کامل اطمینان ہوگیا۔ ایڈیٹر کی آزاد خیالی اور انشا پردازی کی وجہ سے یہ معاصر ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکا ہی۔ اچھے اچھے اخبار جنھیں اپنی خبر رسانی پر گھمنڈ ہی، اور جو اپنی مقبولیت کے مظاہرے کے لیے ہر سال حجم بڑھاتے جاتے ہیں، اتالیقِ ہند کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دعا ہی کہ اس نئے باغ میں ایسے شاداب پھل آئیں جو اہلِ وطن کو محظوظ کر دیں۔"

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

حلقوں میں فرانسیسی کے چلن نے قومی زبانوں کو ترقی حاصل نہ کرنے دی۔ اب جاکر یورپین زبانوں نے فرانسیسی کے تسلط سے آزادی حاصل کی ہی۔ اسی طرح وہ دن بھی آئے گا جب ہندستانی اپنے خوابِ خرگوش سے بیدار ہوں گے اور اپنی زبانوں کو پھر سے زندہ کریں گے۔ یہ تو فطری امر ہی کہ انگریز اپنی زبان کو ہندستان میں رائج کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن سید احمد خاں اور ان کے پیرووں کو کیا پڑی ہی کہ بلا سمجھے بوجھے اس تحریک میں انگریزوں کا ہاتھ بٹائیں؟ اصل میں تو اہلِ ہند کو قدیم عربوں کی پیروی کرنی چاہیے جنھوں نے اپنی زبان میں یونانی کتابوں کو منتقل کیا اور صرف وہ یونانی الفاظ اپنائے جن کا ترجمہ محال تھا ہمیں کبھی یہ غلطی نہ کرنی چاہیے کہ انگریزی الفاظ تو لے لیں اور ان کے ہم معنی اردو الفاظ کو تج دیں۔ آخر 'عیسیٰ' کی جگہ 'جیسس' 'موسیٰ' کی جگہ 'زز' 'داؤد کی بجائے 'ڈیوڈ' اور 'محمد' کی جگہ 'میحومیٹ' لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہی؟ کسی احمق نے تو 'الہ آباد' کے بدلے 'ایلاہا باڈ' لکھنا شروع کر دیا ہو۔ علمی اصطلاحات کے معاملے میں شاید مجبوری ہو لیکن وہاں بھی عربی و سنسکرت کے بہت سے علمی الفاظ مل سکتے ہیں۔ علاوہ بریں ہم اصطلاحات وضع کر سکتے ہیں اور یہ انگریزی کے استعمال سے بہرحال بہتر ہوگا۔ انگریزی نے بھی تو لاطینی و یونانی کی اصطلاحات مستعار لی ہیں پھر کسی ایسی زبان کے آگے ہاتھ کیوں پھیلایا جائے جو خود دوسری زبانوں کی محتاج ہو۔ جہاں تک ناموں کا تعلق ہو۔

ان میں بھی تبدیلی واجب نہیں۔ انگریزوں کی طرح 'دتی' کو 'ڈلہی'، یا 'اودھ' کو 'آوڈ' کہنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کسی گدھے نے تو سراج الدولہ کے بدلے 'سورج دولہ' لکھ مارا ہے۔

اگر ولایتی الفاظ کے استعمال سے مقصد انگریزی زبان کی ترویج ہے تو اس اینچ پینچ سے کیا حاصل، سیدھے سیدھے انگریزی کی تعلیم دیجیے۔ اگر مُراد یہ ہے کہ لوگ علمی زبان سے واقف ہوں تو یہ طریقہ قطعاً غلط ہے۔ کسی ہندستانی سے پوچھ دیکھیے کہ وہ 'کریسپانڈینس' Correspondence سمجھتا ہے یا 'خط وکتابت'، 'آرٹکل' Article سمجھتا ہے یا 'مضمون'۔ کیا یہ ضروری ہے کہ جدید علوم سے آشنا ہونے کے لیے ہم اپنی زبان بھول جائیں۔ انگریزی لفظ کیمسٹری Chemistry 'کیمیا' سے نکلا ہے تو پھر ہم اس عام فہم لفظ کو تج کر غیر مانوس انگریزی کو کیوں چلن دیں"

دست خط کے معاملے میں یورپین طریقے کی نقل بھی فضول ہے۔ نام کے اجزا کے پہلے حروف کو گھسیٹ کر لکھ دینے سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

(۴)

اخبار ہند ویرکاش تعلیم کے قدیم وجدید طریقوں کا مقابلہ ان الفاظ میں کرتا ہے[؎] "پرانے زمانے کی مشکلات اور اس دور کی آسانیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ پہلے کتابیں قلمی ہوتی تھیں جن کی قیمت ہر ایک ادا کرسکتا تھا، اب چھاپے خانوں[؎]

؎ ۲۴ فروری ؁۵۷ء

[illegible]

جلسے میں یہ رپوٹ پڑھی گئی اس میں صوبے کے ناظمِ تعلیمات بھی موجود تھے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ صوبے کی درس گاہوں میں بریلی کالج کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ فارغ التحصیل طلبا کو انھوں نے مشورہ دیا کہ علم سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھیں اور ان میں سے کئی کے نام گنائے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہیں[1]

پنجابی نے لکھا ہی کہ[2] سرکاری درس گاہوں میں تین باتوں کا ہونا لازمی ہی: (۱) علم و ادب کی تعلیم (۲) زبانوں کا درس (۳) طلبا کے جسم اور دماغ کی تربیت۔ جہاں تک جدید علوم و ادبی مضامین کا تعلق ہی ہم صوبۂ پنجاب کے مدّاح ہیں اور اس کی کوششیں بروئے کار آرہی ہیں۔ زبانوں کے درس پر بھی پورا پورا زور دیا جارہا ہی اور ان میں سے کئی کے پڑھانے کا انتظام کالجوں میں کیا گیا ہی۔ پھر بھی ایک ایسی خامی نظر آتی ہی جس کا ازالہ فوراً ہونا چاہیے۔ ہمارا اشارہ تلفظ کی طرف ہی جس پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ الفاظ کے صحیح معنے جاننے سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ ان کا صحیح تلفظ بھی آنا چاہیے۔ یہ نہ ہو تو بولتے وقت مطلب خبط ہو جاتے گا اور غلط بولنے والے کا مضحکہ ہوگا۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے اس چیز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آیندہ اُن طلبا کو انعام دینے کا فیصلہ کیا ہی جو تلفظ کی صحت کا خاص خیال رکھیں گے۔

---

[1] پنجابی یکم مئی ۱۸۶۵ء

[2] ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

اسکولوں میں لازمی طور پر جسمانی ورزش کا انتظام ہونا چاہیے۔
اس چیز کو پڑھنے سے کم اہم نہ سمجھنا چاہیے۔
لیکن پنجاب میں استاد یا طالب علم کوئی اس پر دھیان نہیں دیتا۔
اُستاد سوچتے ہیں کہ یہ تضیعِ اوقات ہے۔ طلبا عام طور پر ذہین ہوتے
ہیں لیکن جسمانی کمزوری کی وجہ سے زیادہ عرصہ تعلیم جاری نہیں
رکھ سکتے۔ اسی وجہ سے دوسرے ملکوں کے طلبا جو چیزیں آسانی
سے سیکھ لیتے ہیں ان کے سیکھنے میں انھیں سخت محنت کرنی پڑتی
ہے۔ ہم بچپن سے جسمانی قوت کو پنپنے نہیں دیتے اس لیے وہ
رفتہ رفتہ مُرجھا کر رہ جاتی ہے۔ اسی لیے طلبا اکثر صحت کو خراب
کر کے اسکولوں میں نام پیدا کرتے ہیں۔ ہم محکمۂ تعلیمات سے درخواست
کرتے ہیں کہ طلبا کی جسمانی تندرستی کی طرف سے بے توجہی
نہ برتے کیوں کہ اگر تعلیم حاصل کرنے میں صحت برباد ہو جائے
تو ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ہے۔"

سائنس اور آرٹ کی تعلیم کے ... علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
لکھتا ہے کہ[1]: "محکمۂ تعلیم کی توجہ سے پنجاب کو جہالت سے نجات
ملتی جاتی ہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے تاہم
ہر جگہ ایک سی تعلیم مفید نہیں ہو سکتی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ موقع
و محل کے لحاظ سے انسان کی ضرورت بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ تعلیمِ عامّہ کا یکساں معیار کسی کو نہیں بھاتا اور اسی لیے
لوگ سرکاری درس گاہوں کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ ان

[1] ۱۲ جنوری ۱۸۷۵ء

میں تہذیب وتربیت پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ اگر بچوں نے اسی طرح پڑھ لیا جس طرح جانور چر لیتے ہیں تو کیا ہوا۔ آدمیوں کو توتوں کی طرح رٹانے سے کچھ نہ ہوگا۔ جب تک معلّم طلبا کے ذہن کی تربیت اور ان کے آداب کی اصلاح نہ کریں گے ہماری نئی پود کوئی خاص ترقی نہ کرے گی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ محکمۂ تعلیم دیہاتوں میں کاشت کاری اور دست کاری کی تعلیم کا انتظام کرے۔ پڑھ لکھ کر اس قابل بھی تو ہونا چاہیے کہ روٹی کما تی جاسکے۔ عوام کو ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں جو لڑکوں کو محنت سے نفرت کرنا سکھلائے۔ کسان اپنے بچّوں کو اسی لیے اسکول نہیں بھیجتے کہ وہ پڑھ لکھ کر کھیتی کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ لطف یہ کہ جس ہندستانی کو کچھ شُد بُد آگیا وہ سرکاری ملازمت مانگنے لگتا ہے۔ گویا تعلیم صرف اس لیے حاصل کی جاتی ہے کہ نوکری مل سکے۔ جب تک طریقۂ تعلیم میں اصلاح نہ ہوگی یہی ذہنیت باقی رہے گی۔

ترقی یافتہ ملکوں میں ہر قسم کی درس گاہیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم ختم کر کے طالب علم اپنی طبیعت کے مطابق فوجی، دست کاری، طبّی یا کاشت کاری کے اسکول میں داخل ہو سکتا ہے۔ کاش ہمارا محکمۂ تعلیم بھی اسی طریقے پر عمل کر سکے تو کتنا اچھا ہو۔ نئی درس گاہیں کھولتے وقت اگر اس قسم کے افادی مدرسے بھی بن جائیں تو طلبہ کو اپنے مستقبل کے بنانے میں زیادہ دقت نہ پیش آئے"

اس اخبار نویس کی خواہش کی تکمیل بھی ہوتی

کہ لاہور میں "صنعتی آرٹ کا اسکول" Mayo Industrial Art School قائم ہو گیا[1] صوبۂ پنجاب کی حکومت مختلف شہروں میں اس قسم کے صنعتی مدرسے کھولنا چاہتی ہی۔ نصاب اس تجویز کے مطابق ہوگا جو پرتاپ چندر گھوش نے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کی تھی[2] اُدھر بہار کی ادبی مجلس نے اپنے سرپرست سر رچرڈ ٹمپل Sir Richard Temple کے مشورے سے سائنس کی تعلیم کے لیے تجویز تیار کی ہی اور صنعتی مدرسے کھولنے کا ارادہ کیا ہی۔

حیدرآباد دکن میں جاگیرداروں اور امرا کے لڑکوں کے لیے کالج قائم کرنے کا سارا انتظام ہو چکا ہی۔ صرف طلبا کی کافی تعداد کا انتظار ہی۔ بیس سال سے کم عمر کے طالب علم داخل کیے جائیں گے اور تین سال کا نصاب ہوگا۔ فارسی اور عربی کے علاوہ حساب اور ہندستان کی تاریخ و جغرافیہ بھی پڑھایا جائے گا۔ کالج میں سرکاری ملازم بھی داخل ہو سکیں گے اور جو امتیاز کے ساتھ امتحان پاس کریں گے، انھیں ترقی ملے گی[3]

بڑودہ میں جو کالج کھلنے والا ہی، اس کا نام شاہزادۂ ویلز سے منسوب ہوگا۔ اس کے پرنسپل کے عہدے کے لیے ایک تجربے کار ہندستانی عالم کا انتخاب کیا گیا ہی۔

گزشتہ ۲۸ جنوری کو لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن

---

[1] Indian Mail ۲۵ اکتوبر ۷۵ء

[2] ایضاً ۷ جون ۷۵ء

[3] پنجابی ۳۱ جولائی ۷۵ء

East India Association کا ایک جلسہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہوا کہ اہلِ ہند کو ان کی تعلیم کا انتظام سونپ دینا کس حد تک مناسب ہوگا۔ مشہور ماہرِ مشرقیات اور پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر ایسٹ وک Eastwick نے جلسے کی صدارت کی۔ ڈاکٹر لائٹنر Leitner نے شکایت کی کہ حکومت نے نہ تو انتظامی اور تعلیمی معاملات میں اہلِ ملک کا تعاون حاصل کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ یہ تعاون صرف مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے خصوصاً تعلیمی امور میں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ ہندستانیوں کو پنچایتوں کا اتنا تجربہ ہے کہ جب کبھی ان سے انتظامی معاملات میں مشورہ کیا گیا وہ بہت مفید ثابت ہوا۔ سر الیگزینڈر ارسبتھ نوتھ اور مسٹر گرفن Griffin سکریٹری حکومتِ پنجاب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

مسٹر گرانٹ ڈف Grant Duff ہندستان کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ اس سے ملک کا بھلا ہوگا کیوں کہ اس ممتاز عہدے دار کو ہندستان کا اتنا تجربہ ہے کہ وہ انتظام کی بہتری کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مسٹر ڈف ان اصلاحات کی تجویز اپنے سفرنامے میں شامل کریں گے جس کے کچھ حصے کنٹمپریری ریویو Contemporary Review میں شائع ہو چکے ہیں۔[1]

سید احمد خاں کے مجوزہ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی لکھتا ہے:[2] "یہ سوچنا جہالت کی

---

[1] Notes on an Indian Journey جون ۷۵ء

[2] ۲۷ فروری ۷۵ء

انتہا ہو کہ ہندستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ حقیقت یہ ہو کہ یہ اسلام کے اصولوں کا کرشمہ تھا کہ بنگال کے تین کروڑ اور مالا بار کے لاکھوں آدمی اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے۔ یہ دیکھ کر انگریز قیاس کرتے ہیں کہ اسی طرح کچھ سال میں شاید عیسائیوں کی تعداد بھی بڑھ جائے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ پادریوں کی دوڑ دھوپ کے باوجود لوگ ان کے مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں دکھلاتے۔ اب وہ اُس دن کے خوش آیند خواب دیکھ رہے ہیں جب عوام کی مت پھرے گی اور وہ ان کے فرقے میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ بھی عجیب ماجرا ہو کہ بھولا بھٹکا مسلمان عیسائی ہو گیا وہ سال دو سال بعد توبہ کرکے اپنے اجداد کے راستے پر لوٹ آتا ہو لیکن جو عیسائی ایک بار مسلمان ہو گیا وہ دوبارہ اپنا مذہب نہیں بدلتا۔ یہ عیسائی مادّی اسباب کی بنا پر اسلام کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ اسی لیے ان کا ایمان راسخ ہوتا ہو۔ یہ سچ ہو کہ کچھ ایسے گرے ہوئے انگریز اور مسلمان بھی ہیں جو محض دُنیوی اغراض کے لیے تبدیلِ مذہب پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزوں کے وسائل ہندستانیوں سے بہرحال زیادہ ہیں لیکن جو اُعلا خاندان انگریز مسلمان ہوتے ہیں وہ یقیناً اسلام کے اصولوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

اسلام کی خوبیوں کا اعتراف غیر مذاہب کے اکثر انصاف پرور عالموں نے کیا ہو جن میں انگریز بھی شامل ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی بعض کتابوں کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو چکا ہو۔ ان کے پڑھنے

[illegible]

آج مسلمانوں کی جہالت کا یہ حال ہو کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو بھی بھول گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ زمانے کی آواز پر لبیک کہتے اور دنیا کی پیشوائی کرتے۔ شکر ہو کہ ہمارے بعض اکابر اپنی قوم کو صحیح راستے پر لے جانے کی سعی کر رہے ہیں۔ یہ ہماری ترقی کی ابتدا ہو۔ لیکن کیسے افسوس کا مقام ہو کہ ابھی سے ان کے خلاف پارٹی بندی شروع ہو گئی ہو۔ کیا اچھا ہو کہ سب مسلمان متفق ہو کر ان سے تعاون کریں۔"

۱۱ فروری کو الہ آباد میں اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کالج کی عمارت کے لیے حکومت نے وافر زمین عطا کی ہو۔ جلسے میں اعلان ہوا کہ عمارت کے لیے اب تک کچھ کم دو لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔ یہ رقم صرف مسلمانوں کی دی ہوئی نہیں ہو۔ مہاراجا پٹیالہ نے دس ہزار روپے اور لارڈ اسٹینلی Staneley نے سو پونڈ دیے ہیں۔ جلسے میں سید احمد خاں نے ایک پُرجوش تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس کالج کا قیام کیوں ضروری ہو۔ یہی بات سید محمود اور مولوی فریدالدین نے بھی کہی۔ ان تقریروں سے متاثر ہو کر ایک مسلمان رئیس نے ایک گانو کی آمدنی کالج کے لیے وقف کر دی اور اسی وقت حاضرین نے چندے میں چار ہزار روپے دیے۔[۵]

اسی یکم جون سے کالج سے منسلک ایک ابتدائی اسکول

[۵] علی گڑھ اخبار ۱۲ فروری ۱۸۷۵ء

علی گڑھ میں کھل گیا ہے جس کی نگرانی مولوی سمیع اللہ خاں کے سپرد کی گئی ہے۔ فیس برائے نام ہے اور نادار طلبا کو مفت تعلیم دی جائے گی۔ اسکول میں اُردو فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی بھی پڑھائی جائے گی۔ سُنّی اور شیعہ طلبا کی مذہبی تعلیم کا علاحدہ علاحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ انتظامیہ کمیٹی کو مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ہندو عیسائی یا یہودی بھی اس کے رُکن ہو سکتے ہیں۔ اس کالج کا نظام سرکاری درس گاہوں سے مختلف ہوگا۔ کالج میں طلبا اور پروفیسروں کی رہائش کا انتظام ہوگا۔ وقت آنے پر تین مقتدر طلبا کا انتخاب کیا جائے گا جو کالج کے رفقا Feilows کی حیثیت سے رہیں گے۔ اسکولوں میں بھی زیادہ سے زیادہ طلبا کو رہائش کے لیے مجبور کیا جائے گا تاکہ وہ تربیت اور ضابطے سے بہرہ مند ہو سکیں[۱]

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے موقع پر ایک مقتدر مجمع کے آگے علی گڑھ کالج کی رسمِ افتتاحیہ ادا کی گئی۔ علی گڑھ اخبار کی ۲۷ و ۲۹ مئی کی اشاعت میں اس جلسے کی تفصیل شایع ہوئی ہے۔ اس کی صدارت علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم نے کی۔ بعد ازاں سائنٹی فک سوسائٹی کے سکریٹری مولوی سمیع اللہ خاں نے کالج کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ ایک صاحب ہندستان کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا ذکر کرتے کرتے رونے لگے۔ لیکن آنسو ضبط کر کے انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ

---

[۱] علی گڑھ اخبار ۳۰ اگست ۱۸۷۵ء

مصیبت کے دن بھی ٹل جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آج مسلمان انگریزوں کے خادم ہیں لیکن کبھی نہ کبھی وہ رُوحانی و مادّی دونوں اعتبار سے ترقّی حاصل کریں گے۔

ایک اخبار نے لکھا ہو کہ کالج کے افتتاح کی خبر سے ملک بھر کے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ ان کا فرض ہو کہ اسے کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کریں۔ اس موقع پر خواجہ حالی نے 'مبارک باد' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس کا ردیف قافیہ "آج ہو" تھا۔ یہ نظم بے حد پسند کی گئی (یہاں ۱۱ اشعار کا فرانسیسی ترجمہ درج ہو)

پنجاب کے ۳۲ اضلاع میں سے صرف گرداس پور میں پٹواریوں کے لیے ایک خاص مدرسہ ہو۔ ایک درجے میں آبائی، دوسرے میں ملازم اور تیسرے میں امیدوار پٹواری رکھے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی جملہ تعداد ساٹھ ہو۔ ممکن ہو کہ ہر ضلع میں اسی قسم کے مدرسے قائم ہو جائیں[۵۱]

سنبل پور (صوبۂ متوسط) میں سُنّی مسلمانوں کا ایک مدرسہ ہو جسے ایک استاد کی ضرورت ہو جو اُردو و فارسی کے علاوہ حساب بھی پڑھا سکے[۵۲]

پچھلے سال اودھ میں ۱۳۲۶ درس گاہیں تھیں جن میں ۳۶۵۴ طلبا تھے۔ گویا ایک سال میں ۲۶ درس گاہوں اور ۳۲۰۵ طلبا کا

[۵۱] اخبار انجمنِ پنجاب ۵ فروری ۷۵ء
[۵۲] اودھ اخبار ۲۲ اگست ۷۵ء

اضافہ ہو گیا۔

بنگال میں دس کالج اور ہائی اسکول ایسے ہیں جو سرکاری ہیں۔ پانچ کالج امدادی ہیں اور تین کو کوئی مدد نہیں ملتی۔[۱]

سر سالار جنگ کو تعلیمِ نسواں سے بڑی ہمدردی ہے۔ چناں چہ کلکتے کے سفر میں انھوں نے فیمیل نارمل اسکول آف انڈین ریفارم ایسوسی ایشن Female Normal School of Indian Reform Association کو پانسو پونڈ کا عطیہ دیا۔

بمبئی کے الگزنڈرا نیٹو گرلز انگلش انسٹی ٹیوشن Alexandra Natives Giris English Institution کی سالِ گزشتہ کی رپوٹ میری نظر سے گزری۔ اسے مانک جی کرسٹ جی نامی پارسی نے قائم کیا ہے۔ رپوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقصد میں پوری طرح کام یاب ہے۔

ٹراونکور میں تعلیمِ نسواں کا بڑا زور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے کسی دوسرے علاقے کی عورتوں میں تعلیم کا اتنا چرچا نہیں ہے۔ زنانہ مشن نے عیسائی اور ہندو لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول کھول رکھے ہیں۔

مدراس میں مسلمان لڑکیوں کا مدرسہ لیڈی ہربرٹ کی سرپرستی میں برابر ترقی کر رہا ہے۔ یہ شریف خاتون کچھ عرصے کے لیے انگلستان گئی ہیں اور جاتے جاتے انھوں نے اپنے مدرسے کو دس ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔[۲]

---

[۱] علی گڑھ اخبار یکم جنوری ۱۸۷۵ء

[۲] Indian Mail ۲۳ اگست ۱۸۷۵ء

[illegible]

Palmer

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] ......

[illegible]:-

[illegible]
[illegible] (uoɪɪəɐɥ) [illegible]
[illegible] الله [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

سے نکل آیا۔ اپنے سائنس اور ہنر کی وجہ سے انگریز دنیا میں انتخاب ہیں۔ ان کی مدد سے ہم بھی بامِ ترقی پر چڑھیں گے اور ایک روز پھر اپنے پُرانے منصب کو حاصل کریں گے۔ ہماری زندگی کے باغ میں امید کا بیج لگ چکا ہو اور رحمت کی بارش اس میں ترقی کے پھول لائے گی۔ پھر ہماری جہالت اور نوبت کے کانٹے بے نشان ہو جائیں گے۔ ہر طرف اسکولوں اور کالجوں کی گھما گھمی ہو گی، ہر طرف کارخانوں کی چرخ چوں کی صدا آئے گی، ہر طرف جدید علوم کی ترقی کے لیے انجمنیں بنیں گی اور ہر دل میں ترقی کی آرزو ہو گی۔ علم کی روشنی شہروں میں ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی پہنچے تو کام بنے۔ اسی غرض سے ہمارے چھوٹے سے شہر میں یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہو۔

آج اس چھوٹی سی بستی میں علم کی روشنی جگمگا رہی ہو لیکن کل کی بات ہو کہ یہاں اُردو و فارسی کے ایک ٹوٹے پھوٹے مدرسے کے سوا کچھ نہ تھا۔ لاہور کے پُرانے کمشنر کی سرپرستی میں ہم نے سال بھر پہلے یہاں ایک اسکول بنایا جس میں اپنی زبانوں کے علاوہ انگریزی، جغرافیہ، حساب وغیرہ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ اس کے بعد ہم نے یہ انجمن بنائی اور اس کے آگے یہ مقاصد رکھے: (۱) ایک چھاپے خانے کا قیام (۲) ایک علمی رسالے کا اجرا جس کے کئی نمبر نکل بھی چکے ہیں۔ (۳) پبلک کے لیے ایک کتب خانے کی تنظیم (۴) ایک کارخانے کی تنظیم جس میں دری اور ریشم کی چادر وغیرہ بنائی جاتے اس میں صرف مرد نوکر رکھے جاتے ہیں۔ ایک

اور کارخانۂ سلائی، گُل کاری وغیرہ کے لیے ہے جس میں صرف عورتیں نوکر ہیں۔ ان کارخانوں کے سامان کی بکری کے لیے اتوار کو خاص طور پر بازار لگتا ہے۔

اس وقت ہماری انجمن کے تین سو ممبر ہیں جن میں ۱۱ یورپین بھی ہیں۔ اگر ہر بستی کے چند افرادِ علم و ادب کی خدمت پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کچھ عرصے میں ہم اہلِ مغرب سے بازی نہ لے جائیں۔"

ہندستانیوں کے سوچ بچار اور رہنے سہنے کے طریقوں میں تیزی سے جو تبدیلی ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ اگر انگریزوں کی حکومت ہے تو دوسری وجہ حالات کو بدلنے کی خواہش بھی ہے۔ مثلاً دُور دراز اجمیر کو ہی لیجیے۔ کئی سال سے نئے خیالات کی اثر آفرینی وہاں نظر آ رہی ہے۔ مقامی انجمن رفاہِ عام کا کام ہی یہ ہے کہ دقیانوسی رسوم کی بیخ کنی کرے[1]۔ پچھلے دسہرے کے موقع پر انجمن نے ایک صنعتی نمایش منعقد کی تھی[2]۔

اجمیر میں ایک خالص اسلامی انجمن بھی بنائی گئی ہے جو "اس اسلامی شہر کو دوبارہ خوش حال بنانے کی کوشش کرے گی۔ مسلمانوں میں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے وہ مدرستہ العلوم کا قیام بھی ضروری سمجھتی ہے۔"

ہوشیارپور (پنجاب) میں بھی مسلمانوں نے ایک انجمن بنائی ہے

---

[1] پنجابی ۲۱ نومبر سنہ ۷۴ء

[2] علی گڑھ اخبار ۲۷ اگست سنہ ۷۵ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لکھنؤ میں ایک سوسائٹی قائم ہو رہی ہو جس میں ہندستانی اور یورپین باہم مل کر سیاسی و علمی مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کیا کریں گے۔ اس قسم کے کلب کلکتہ، علی گڑھ اور لاہور میں پہلے سے موجود ہیں۔[1]

لندن میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی جو شاخ ہو اس کی ۱۸۷۴ء کی رپوٹ مس مینگ نے مجھے بھیجی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً لندن کے ہندستانیوں اور ان کی ترقی کے خواہاں انگریزوں کے مشترک جلسے کیا کرتا ہو۔ وہاں ہندستانیوں کو ایسے انگریزوں سے ملنے کا موقع ملتا ہو جو انھیں مدد پہنچا سکتے ہیں اور ساتھ ساتھ دل چسپ مضامین پر تقریریں بھی ہوا کرتی ہیں۔ انگریزوں کو یہ فائدہ ہوتا ہو کہ وہ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کی زبانی یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کا ملک کیا محسوس کرتا ہو۔ تقریروں کے بعد جو بحث ہوتی ہو اس میں سب فرقوں کے افراد حصّہ لیتے ہیں۔ نوروزجی فریدوں جی نامی پارسی نے ایک مجلس میں اپنے فرقے کی حالت پر تقریر کی اور پھر یہ بھی بتایا کہ ہندستان میں یورپین اہلِ ملک سے کس قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک مسلمان نے پردے کی برائیوں کا تذکرہ کیا۔ ایک ہندو نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ہندستان میں سماجی اصلاح کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے۔

اس ایسوسی ایشن کا ماہنامہ شہر برسٹل Bristol میں مس کارپینٹر کی ادارت میں شایع ہوتا ہو۔ یہ نیک دل خاتون حال ہی

[1] Indian Mail ، ۵ فروری ۱۸۷۵ء

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	.....
[illegible]	[illegible]
[illegible]	..[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	....[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]
[illegible]

(h)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

دنیا میں تبلیغ کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ سننے میں آیا ہو کہ ہندستان میں ان کی تگ و دو کا واحد مقصد یہ ہو کہ جو ہندستانی پروٹسٹنٹ عیسائی ہو گئے ہیں انھیں کیتھولک بنایا جائے۔[1]

اوپر میں نے جن پروٹسٹنٹ مشنوں کا ذکر کیا ہو، انھوں نے سالِ گزشتہ میں پانچ ہزار آدمیوں کو عیسائی بنایا جن میں سے زیادہ تر چھوٹا ناگ پور کے رہنے والے ہیں۔ اُدھر روسی پادری خوشی سے بغلیں بجا رہے ہیں کہ انھوں نے تبّت کے ایک لاما کو عیسائی بنا ڈالا۔[2]

ہمارے پادری صرف مبلغ اور معلم ہی نہیں ہیں۔ ہندستانی زبانوں میں انھوں نے بڑی دست رس حاصل کی ہو اور صرف مدرسوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی ہندستانی کے علاوہ مختلف صوبائی زبانوں میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس لیے اہلِ ملک ان سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ جو غیر ملکی ان کی زبان اور ادب سے دل چسپی رکھتے ہیں، وہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس وقت ۲۵ چھاپے خانوں کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہو جن سے پچھلے دس سال میں تین ہزار چار سو مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلے کی طرح اب یہ مفت نہیں بانٹی جاتیں بلکہ بیچی جاتی ہیں۔ اس سے ان کی عام دل چسپی ثابت ہوتی ہو۔

یہ عجیب بات ہو کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی طرح بہت سے

[1] Quarterly Review اپریل ۷۵ء

[2] Times ۸ ستمبر ۷۵ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ان لڑکوں کا حوصلہ پست نہ ہوا۔ برادری کے مظالم کے باوجود ان کا ارادہ نہ بدلا اور آخر اب جا کر ان کی مراد بر آئی۔ اسی بستی میں ایک کلیسا کی تعمیر ہوئی ہے جس کا نقشہ پادری کلارک کی رپورٹ میں شامل ہے۔ اس کے فرش پر ڈیڑھ سو آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے الگ الگ بیٹھنے کا انتظام ہے۔ دیواروں پر اردو اور ہندی حروف میں انجیل کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔

انھی پادری کلارک کی نوازش سے مجھے بائبل سوسائٹی اور پنجاب کی اشاعتِ مذہبی کتب سوسائٹی کی ساتویں رپورٹ دست یاب ہوئی۔ رپورٹ کے دونوں حصے نو عیسائی سید علی شاہ کے لاہوری چھاپہ خانے میں طبع ہوتے ہیں۔ میں یہاں انجیل کے نسخوں کی تعداد نہیں گنانا چاہتا اور نہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کتنی زبانوں میں چھاپے گئے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس قسم کی اشاعت کتنی کارگر ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ چنبا کے ایک فقیر کے ہاتھ انجیل کا ایک نسخہ لگا۔ اسے پڑھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ فوراً ایک مشنری کے پاس پہنچا اور اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ اطمینان ہوتے ہی وہ عیسائی ہو گیا۔ ایک مسلمان فقیر اور اس کے آٹھ چیلوں پر بھی انجیل کے مطالعے کا یہی اثر ہوا۔ اور بھی بہت سے لوگ اسی طریقے سے عیسائی ہوتے۔ ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ انجیل کی اشاعت بہت مفید ہو سکتی ہے۔ عیسائی اولیا کی زندگی کے حالات بہت سے ہندو مسلمان شوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ مذہبی کتب کی بکری کا کام ملکی عیسائی مبلغوں کے سپرد کیا گیا ہے جو خریداروں کو ان کی اہمیت بھی سمجھاتے جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں اوپر میں نے جس رپورٹ کا ذکر کیا ہے وہ ادبی اعتبار سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیوں کہ اس کے مطالعے سے کئی نئی اُردو اور ہندی کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ یوں ہندستانی عیسائیوں کی جدید مطبوعات کی مکمل فہرست Conference on Urdu Hindi Christian Literature میں مندرج ہے۔

دہلی کے ایک مطبع کے مالک مہدی حسن نے لدھیانہ کے عیسائی اخبار نور افشاں میں اعلان کیا ہے کہ حسب ذیل کتابوں کا جواب لکھنے والوں کو دو دو سو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ یہ کتابیں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیت کی تردید میں لکھی گئی ہیں:

(۱) دقیقۃ الوداد جواب ہے نیاز نامہ مصنفۂ پادری عماد الدین کا

(۲) لحنِ داؤدی جواب ہے نغمۂ طنبوری مصنفۂ رام چند کا

(۳) استقلال جواب ہے دجال مسیح مصنفۂ صفدر علی کا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا جوش و خروش ٹھنڈا نہیں پڑا اور وہ پادریوں کو ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں۔ اُدھر ان کے اپنے گھر میں اختلاف کی آگ سُلگ رہی ہے۔ حال ہی میں وہابیوں کے مشہور مخالف مولوی محمد عمر رام پوری نے وہابی عالم مولوی شکر اللہ کو ایک مناظرے میں شکست دی۔ اس کامیابی پر اخبار پنجابی نے انھیں "شمشیرِ آب دار برگردنِ وہابیہ اشرار" کا بھاری بھرکم خطاب دیا ہے[1]

اس سال بھی مسلمانوں نے کئی عیسائیوں کو مرتد کر لیا۔ ان

[1] ۳۱ جولائی سنہ ۶۵ء

کلھا سے تین جہازی مدراس کی ایک مسجد میں مسلمان ہوگئے۔ کیپٹن کر Kerr نامی انگریز نے بمبئی میں اسلام پر لبیک کہا اور اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میں آج تک اتنا خوش نہ تھا، اب پانچ وقت کی نماز کے بعد دن رات میں سات مرتبہ کھانا مل جاتا ہے۔[1]

اس سلسلے میں بنگلور اگزامینر Bangalore Examiner لکھتا ہے:[2] کسی کو یقین نہ آئے گا کہ یورپین ہندستانی اگر مسلمان ہوجاتے اور اپنی ملت کو بدنام کرتے ہیں لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے۔ بعد ازاں یہ اخبار چار انگریزوں کے نام گنا تا ہے جو بنگلور میں اسلام پر ایمان لے آتے ہیں۔ یہ پالا وہابیوں نے مارا جو کٹر توحید پرست ہیں۔ انھیں مسلمان کرنے کے لیے حیدرآباد سے ایک مولوی بنگلور آیا اور اس وقت تک انتظار کرتا رہا جب تک ان کے بیے انگرکھے اور پاے جامے نہ مل گئے اور وہ اس سج دھج سے مسجد میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک انگریزی فوج میں کپتان ہے اور دوسرا سپاہی۔ دونوں نے عبداللہ کا نام انتخاب کیا۔ ان کی عمر ۴۴ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ آئرلینڈ کے ایک جوان سال جہازی O Neil کو عبداللطیف کا نام ملا۔ چوتھے کی عمر بھی ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور وہ عبدالسلام کہلایا۔ ان نومسلموں کا ولولہ ملاحظہ ہو کہ مسجد سے نکلتے ہی ایک لڑکے کا مونڈ کر اسے زبردستی مسلمان بنانے کی

[1] Indian Mail ۲۴ مئی [illegible]

[2] بہ حوالہ اخبار عالم میرٹھ ۱۰ فروری [illegible]

کوشش کرنے لگے اور تبلیغِ اسلام کے لیے چندہ بھی وصول کیا۔ اسی زمانے میں ایک نومسلم انگریز فقیر کا بھیس بدلے، شادی کی نیت سے بنگلور آیا۔ یہ چار یار اس کے ساتھ میسور چل کھڑے ہوئے۔ اخبار کا بیان ہو کہ انھوں نے اعلان کیا: "ہمیں اپنے پرانے ملک اور پرانے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اب ہم اسلام کے فدائی ہیں۔"

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہو کہ نارمن Norman نامی پادری جو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا مسلمان ہوگیا اور اب امریکہ جاکر اسلام کی اشاعت کر رہا ہو۔ پچھلے مقالوں میں میں مسلمانوں کی جس عالم گیر بیداری کا ذکر کر چکا ہوں، اس سے ہندی مسلمان مستثنا نہیں ہیں۔ اخباروں کا بیان ہو کہ سلطانِ ترکی دنیا بھر کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی دُھن میں ہیں اور وہ چین کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنا سفیر پیکن میں تعینات کر رہے ہیں۔

راج پوتانہ کے مشنریوں کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے اجمیر، نصیرآباد، آشاپورہ اور ٹاڈگرطھ میں یتیموں کے اسکول کھول رکھے ہیں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر دیہاتوں میں تعلیم پھیلا سکیں۔ ان میں سے کئی مشن کے چھاپے خانوں یا گرجاگھروں میں ملازم ہوگئے ہیں۔ ان میں سے کئی کو علمِ طب بھی سکھایا جاتا ہو کیوں کہ دواخانوں کی نگرانی بھی مشنریوں کے ذمّے ہو۔ ان میں سے تنہا بیاور کے اسپتال میں ۳۱ء میں بارہ سو بیماروں کا علاج ہوا۔ بیمار اچھے ہوکر پادریوں کی بات پر کان دیتے

ہیں اور اکثر عیسائی بھی ہو جاتے ہیں۔

راج پوتانہ میں پادریوں نے بہت سے اسکول کھول رکھے ہیں لیکن ان کی مذہبی تعلیم نے پچھلے سال کوئی اثر نہ دکھایا صرف ۱۴ افراد عیسائی بنے۔

نامور عیسائی کارکن جان مردوک John Murdock کا ذکرِ خیر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے ایک رسالے میں بتایا ہے کہ ہندستان میں عیسائیوں کو ایسا ادب پیدا کرنا چاہیے جو اہلِ ملک کے لیے کشش رکھتا ہو۔ اس غرض سے انھوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس بھی کی تھی۔ مسٹر مردوک نے کہا ہے کہ سنہ ۶۹ء سے اب تک اردو میں ۱۴۱۴ اور ہندی میں ۲۲۰ عام دل چسپی کی کتابیں اور رسالے چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں کی فہرست بھی پیش کی جو عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کے لیے الگ الگ کتابیں تصنیف کی جائیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پادریوں کو رومن رسم الخط سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے کیوں کہ یہ مسلمانوں کو ناپسند ہے۔ باتصویر کتابیں بہت مقبول ہوں گی اور امرت سر کے پادری بیرنگ Baring کی یہ رائے صحیح ہے کہ عمدہ قسم کا ادب عام دل چسپی کا باعث ہوگا۔[۱]

بمبئی کے پادری ڈگلس DOUGLAS نے اپنے صوبے میں

---

۱. Proposed Conference on Urdu and Hindi Literature at Bombay 1871

عیسائیت کی اشاعت کے متعلق ایک اہم خطبہ پڑھا۔ فرمایا کہ تمام عیسائی فرقوں کو باہم مل جُل کر تبلیغ کا کام کرنا چاہتے ہیں اور ہندستانیوں کو عیسائیت کی تلقین کرتے وقت آپس کے جھگڑوں کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔

کلکتہ کے پادری نے اس سال مشرقی بنگال اور آسام کا دورہ کیا۔ مذہبی چندے کے لیے لاٹری کی جدت کی انھوں نے سخت مذمت کی اور کہا کہ کارِ خیر میں ایسی بدعت سے برکت نہیں ہوسکتی۔

یہ ظاہر ہی ہو کہ پادریوں کو عوام کی مخالفت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی خدمت انجام دینی پڑتی ہو۔

انبالہ میں سکھوں کی ایک پلٹن میں صرف اس وجہ سے بغاوت ہوتے ہوتے رہ گئی کہ ایک سپاہی کا لڑکا فوجی اسکول کے اثر سے عیسائی ہوگیا۔ اس پلٹن کے کئی سپاہی برسوں پہلے برضا و رغبت عیسائی ہو گئے تھے اور ان کی تعلیم کے لیے پادریوں نے ایک اسکول کھول دیا تھا۔ وہ لڑکا اسی اسکول میں آیا کرتا تھا۔ اس کے عیسائی ہوجانے سے ایسی ہڑبونگ مچی کہ کرنل کو اسکول بند کر دینا پڑا اور سپاہیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی ممانعت کر دینی پڑی۔

پال گھاٹ کے جرمن پادری DIER نے اس سے بھی زیادہ ہولناک حادثے کی اطلاع دی ہو۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے مشن کی ایک عمارت کو جلا ڈالا اور نو عیسائیوں کو بری طرح پیٹا۔ اگر کوچین کا انگریز ریذیڈنٹ ان میں سے ایک کنبے کو پناہ نہ دیتا تو لوگ اس کی جان لے کر چھوڑتے۔

ہندوؤں کے کٹرپن کا بھی یہی حال ہے گو کہ اس کی شدت کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہے۔ سکندر پور میں کالو نامی ہندو رہا کرتا تھا جو پوجاپاٹ کا بڑا پابند تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ مرگیا اور ایک جوان بیوی اور شیرخوار بچہ چھوڑ گیا۔ بیوہ پر اس سانحے کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور دن رات اپنے شوہر کا ماتم کرنے لگی۔ ایک دن سناٹا پاکر اس نے لکڑیوں کا انبار جمع کیا، چتا بنائی اور آگ لگا کر بچے کے ساتھ اس پر لیٹ گئی۔ جب تک لوگوں کو خبر ہو اور وہ پولیس کو اطلاع دیں یہ دونوں بدنصیب جل کر خاک سیاہ ہوگئے۔ بستی کے لوگوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہمیں بیوہ کے ارادے کی مطلق خبر نہ تھی۔

کئی سال پہلے میں نے ایک مسلمان مضمون نگار کے حوالے سے ہندوؤں کی ایک قبیح رسم "انترجلی" کا ذکر کیا تھا۔ حکومت کی آنکھ بچا کر اب بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اب مرنے والے کو عینِ حیات تو گنگا میں نہیں پھینکتے لیکن بیمار کی حالت نازک ہوتے ہی اس کی خبرگیری بند کر دی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دم نکلتے ہی اُسے گنگا میں ڈبو دیا جائے تاکہ اس کی روح کو نجات حاصل ہو۔ انگریزی کے اخباروں میں اس قسم کے دو واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ گزشتہ ۱۲ مئی کو کلکتہ کے بازاروں سے ایک ارتھی نکلی جس میں ایک مفروضہ لاش تھی لیکن ارتھی کا سر ڈھنکا نہ تھا اور لوگوں نے دیکھا کہ آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے مُردے کا ہاتھ اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر مُردے کے لڑکے

کے سر پر چھتری کا سایہ کر دیا۔ ندی کنارے پہنچ کر ارتھی زمین پر رکھ دی گئی۔ وہاں مُردے کو پیاس لگی اور اُسے دودھ پلایا گیا۔ اُسے لوہے سے داغا گیا کہ جان جلد نکل جائے۔ لیکن جب دو روز تک یہ سخت جان نہ مرا تو اُسے دوبارہ گھر پہنچا دیا گیا اور وہاں اُسے پانی میں اتنی ڈبکیاں دی گئیں کہ اُسے مرتے ہی بنی۔

حال ہی میں الہ آباد میں ایک بُڑھیا گنگا کے کنارے جاں کنی کی حالت میں پہنچا تی گئی۔ اس کی جان جلدی نہ نکلتی تھی اس لیے اس کی لڑکیوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ کچھ کہتی تھیں کہ اسے جلا دیا جائے، باقی کی رائے تھی کہ لکڑی کیوں ضائع کی جائے اسے دفن کر دیا جائے۔ اس بحث بحثی کے دوران میں وہ دُکھیاری بڑھیا چُپ چاپ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ آخر میں لڑکیوں نے طے کیا کہ اسے ریل میں بٹھا کر گھر واپس لے چلیں لیکن ریل والوں نے ادھ مری بڑھیا کو سواری کی اجازت نہ دی۔ لڑکیوں نے سوچا کہ چلو اس کا پارسل بنا دیں، پھر کسی کو خبر نہ ہوگی اور یہ دوسرے سامان کے ساتھ ریل پر لد جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے یہی کیا!!!

مقالے کے آخر میں حسبِ دستور میں ہندستانی عالموں، ادیبوں اور مشرقیات کے اُن ماہروں کا ماتم کروں گا جو ہمیں پچھلے سال داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن [illegible] سے پہلے میں اپنے ایک ذاتی غم کے ذکر کی اجازت چاہتا ہوں۔ میری رفیقۂ حیات [illegible] سال تک میرے گلزارِ زندگی کو سرسبز رکھنے کے بعد حال ہی میں ایّامِ خزاں کا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گہرائی کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ ناسخ کی زبان پیچیدہ اور غیر مانوس تھی لیکن ان کے تخیل میں جدت تھی۔

انیس نے مرثیے میں آتش کا اور دبیر نے ناسخ کا راستہ پکڑا۔ شہادتِ حسینؑ تاریخ اسلام کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے اور اس کے واقعات کو نظم کرنے میں دونوں شاعروں نے فن کا پورا پورا کمال دکھایا ہے۔ قدرت نے ہر فن کار کو ایک خاص شخصیت دی ہے اور اس کا رنگ اس کے کارناموں پر چھایا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'انیس' اور 'دبیر' اسکول کی اپنی خصوصیتیں ہیں اور وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

انیس کے انتقال کے وقت دبیر زندہ تھے۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ بھی رحلت فرما گئے۔ میں نے اپنی کتاب "ہندوی و ہندستانی ادب کی تاریخ" میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "میرزا سلامت علی دبیر مشہور مرثیہ گو ہیں اور اپنے کمالِ فن کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہیں۔ ان کے استاد میر مظفر حسین ضمیر تھے اور دبیر لائق استاد کے لائق شاگرد ہیں۔ میرے پاس ان کے چار مرثیوں کی نقل موجود ہے۔"

دبیر کے انتقال کی خبر 'پنجابی' نے ان الفاظ میں چھاپی ہے:[1] "افسوس، صد ہزار افسوس کہ گلشنِ معنی اُجڑ گیا، آسمانِ سخن کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ مرثیہ گوئی کا فن آج ختم ہوگیا ہمدردین

[1] ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء۔ دو روز بعد کے پرچے میں دبیر کی موت پر ایک نوحہ فارسی میں اور ایک قطعہ عربی میں شایع ہوا ہے۔

کے شاعر میرزا دبیر کو میر انیس کے بعد دنیا کا رہنا پسند نہ آیا اور اسی غم میں گھل گھل کر وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

"یہ حادثۂ جاں کاہ جس نے لکھنؤ میں صفِ ماتم بچھا دی ہو اسی مارچ کی ایک رات کو برپا ہوا۔ شہر کے علما و امرا، خواص و عوام جوق در جوق دبیر مرحوم کے مکان میں جمع ہوتے اور سارے شہر میں شیون و ماتم کا دل دوز سماں دیکھنے میں آیا۔ ہم میں اس سے زیادہ کہنے کی سکت نہیں کہ اقلیم سخن کے بادشاہ کو اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

۲۰ مارچ کے پرچے میں 'پنجابی' اسی سانحے کے متعلق لکھتا ہے: "میرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور ان کے تقوے کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔ سخاوت میں اپنے وقت کے حاتم تھے۔ کم عمری میں دل گیر کی تلقین پر سلام کہنے لگے تھے لیکن ان کا جوہر مرثیے کی صنف میں آ کر کھلا۔

نصیر الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک تمام شاہانِ اودھ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پچھلے سال دبیر جب کلکتہ گئے تو سابق شاہِ اودھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ واجد علی شاہ نے ان سے برابری کا سلوک کیا اور خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ واجد علی شاہ نے ان کے خیر مقدم میں ایک شعر بھی کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ "مجھے چمپا کی مہک سے دبیر کے کلام کی مہک زیادہ پسند ہے۔" رخصت کے وقت انھوں نے دبیر کو پانچ سو روپے کی پیش کش دی اور اس سال بھی اتنی ہی رقم بھیجی۔

کچھ عرصہ پہلے عظیم آباد میں مرحوم نے ایسے جوش و خروش سے مرثیہ خوانی کی کہ محفل میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن اس کے فوراً بعد اختلاج قلب کی شکایت شروع ہوگئی۔ اسی وقت وہ لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ جہاں چند روز کی علالت کے بعد محرم کے دنوں میں انتقال فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں امیر و غریب مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ دبیر کے صاحب زادہ میرزا محمد اوج نے اس موقع پر چند رُباعیاں کہیں اور جب وہ مجمع کے آگے پڑھی گئیں تو ہر طرف سے آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی۔ اوج کے کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اپنے والد کا نام روشن کریں گے اور شاعری کی دنیا میں شہرت حاصل کریں گے۔

دبیر کی شہرت ہندستان سے نکل کر ایران و عراق تک پہنچ گئی تھی

اس سانحے کے بعد اوج جب حیدرآباد دکن گئے تو سرسالار جنگ نے انھیں مالا مال کر دیا اور ایک منصب بھی پیش کیا لیکن اوج کو لکھنؤ چھوڑنا منظور نہ تھا۔ وطن واپس آکر وہ شعر و ادب کی خدمت میں معروف ہیں[1]

سال کے آغاز میں صرف ۴۹ سال کی عمر میں مشہور ماہر شرق اِل ٹوڈس پرچارڈ ڈیرا دون Iltudus Prichard میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ فوج کی نوکری چھوڑ کر وہ وکالت کرنے لگے تھے۔ بعد ازاں دلّی گزٹ کی ادارت ان کے

[1] اودھ اخبار ۲۵ اگست ۱۸۷۵ء

چھپ رہی ہے اور اس میں انھوں نے جو دل چسپ مضامین لکھے ان کا مجموعہ
Sketches of life in upper India کے نام سے دو جلدوں میں
شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ The first ten years of
administration under the crown ہے ہندستانی
زبان سیکھنے کے لیے ان کی ابتدائی کتابیں بہت عام فہم ہیں۔ علاوہ
بریں انھوں نے "رومن لا" کے ہندستانی ترجمے میں بھی ہاتھ بٹایا۔
چند سال جب وہ لندن جاکر رہے تو ہندستان کی طرف سے کئی موثر
تقریریں کیں۔

مدراس کے گورنر لارڈ ہربرٹ کا ۲۷ اپریل کو انتقال ہو گیا۔ تین
سال سے وہ اس صوبے کے حاکم تھے اور ان کا دورِ حکومت امن و
خوش حالی کی وجہ سے یادگار رہے گا۔ ایک زمانے میں وہ ترکی کے
شاہی بینک کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں رہتے تھے
اور وہاں مسلمانوں سے انھیں جو الفت ہو گئی وہ آخر دم تک باقی رہی۔
عجیب بات ہے کہ انگریز عام طور پر ہندوؤں کی طرف داری کرتے ہیں
اور انھیں فائدہ پہنچانے کی غرض سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے
میں نہیں چوکتے[1] مسلمان یہ سمجھتے اور اس کی بجا طور پر شکایت
کرتے ہیں۔ اس کے برعکس لارڈ ہربرٹ نے ہمیشہ مسلمانوں کے
حقوق کا تحفظ کیا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ مدراس میں انھوں نے

[1] حیرت ہے کہ انگریزوں کو یہ نہیں سجھائی دیتا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی برہمن
ملک کے اصلی حاکم ہیں۔ مسلمانوں کے زمانے میں وہ اسی ذوق و شوق سے فارسی
پڑھتے تھے جس طرح اب انگریزی پڑھتے ہیں۔ مؤلف

حقوق کا تحفظ کیا اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ مدراس میں انھوں نے مسلمان طلبا کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ ان کی بیگم نے مسلمان طالبات کے لیے جو مدرسہ کھولا تھا، مسلم عوام اس کے فوائد کو اب سمجھتے جاتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے مرحومہ کی تصویر مدرسۂ اعظم میں لگا دی ہے۔ لارڈ ہربرٹ کا نام زندہ رکھنے کے لیے مدراس کی نئی بندرگاہ کو "ہربرٹ ہاربر" کا نام دیا جانے والا ہے۔

پریزیڈنسی کالج کی سال گرہ کے موقع پر مرحوم نے 'تعلیم' کے موضوع پر جو تقریر کی تھی وہ خلوصِ جذبات کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور ہوئی اور سب نے اس کی داد دی۔

لارڈ ہربرٹ کے جنازے کے ساتھ ایسا جمِ غفیر تھا کہ اس کے بار سے لکڑی کا ایک پُل ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ کوئی ایک سو آدمی ندی میں گر پڑے۔ فوجی افسروں نے جان پر کھیل کر ان میں سے بہتوں کو بچا لیا صرف تھوڑے سے دریا بُرد ہوئے۔

لارڈ ہربرٹ کا منصب ڈیوک آف بکنگھم کو دیا گیا ہے۔ موصوف اس سے پہلے قابلیت کے ساتھ وزیرِ نوآبادی کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ ان کا تقرر ثابت کرتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ ہندستان کی عمل داری کو کتنی اہمیت دیتی ہے جس کا قدیم ترین انگریزی صوبہ مدراس ہے۔

۲۷ اپریل کو لندن میں ۹۰ سال کی عمر میں جنرل جان برگس John Briggs کا انتقال ہو گیا۔ اس صدی کے پہلے برس میں وہ مدراس کی فوج میں بھرتی ہوئے اور بڑھتے بڑھتے جنرل کے عہدے کو پہنچے۔ مرہٹوں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں ان میں

وہ شامل تھے اور بھونسلا شاہی کے خاتمے کے بعد ناگ پور میں کمشنر ہوئے۔ پنشن لینے کے بعد وہ کئی سال پیرس میں رہے اور اس زمانے میں میری ان کی دوستی ہوئی۔ یوں تو انھوں نے ہندستان کے متعلق بہت کچھ لکھا لیکن ان کی شہرت کا مدار تاریخِ فرشتہ اور سیر المتاخرین کے ترجموں پر ہے۔

پیرس میں ۱۰ مئی کو نامور ماہرِ مشرقیات ایف۔ جی۔ ایچ ہاف F. G. Eichhoff اس دنیا سے سدھارے۔ انھیں قدیم سنسکرت شاعری سے عشق تھا۔ اس کے کئی شاہکاروں کے تراجم انھوں نے فرانسیسی اور لاطینی میں کیے۔ ان کا اصل کارنامہ "یورپ اور ہندستان کی زبانوں میں مشابہت" نامی کتاب ہے جس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا ہے۔ میں یہاں شمالی و مشرقی یورپ کی زبانوں کے متعلق ان کے رسالوں کا ذکر نہیں کرتا جن کی وجہ سے وہ علمی دنیا میں مشہور ہیں۔ اپنے انکسار کی وجہ سے وہ منظرِ عام پر نہیں آئے اور انھیں وہ شہرت نہ ملی جو اُن کا حق تھا۔

۲۶ مئی کو احاطۂ بمبئی کے ایک شہر چیٹ کلا Chitkala میں برار کے ناظمِ تعلیم ڈاکٹر سنکلیر کا ۵۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ ڈبلن یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور طالب علمی کے زمانے میں یونانی زبان، ریاضی اور موسیقی میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں وہ بمبئی کے الفنسٹن کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور تقریباً دس سال تک اس خدمت پر فائز رہے۔ اس دوران میں وہ بمبئی یونی ورسٹی کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے۔ بمبئی کے نسخے کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ " دیوان کا کوئی قلمی نسخہ کتابت کی غلطیوں سے خالی نہیں۔ لیکن اسے دو چار مختلف نسخوں کے مقابلے کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور حسبِ ضرورت متن کی تصحیح بھی کی گئی ہے یعنی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں جو ظاہر ہے کہ نہایت آسان دیوان کو مرتب کرنے والوں کو نام نہاد اصلاح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کا خیال تھا کہ ولی کے دیوان میں بعض متروک الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ترتیب دینے والوں کو اصلاح دیتے وقت یاد نہ رہا کہ ولی نے دکنی اردو میں شاعری کی اور اس زبان کے محاورے شمال کی موجودہ زبان میں لامحالہ ناپید ہوں گے۔ ولی کے کلام کی خصوصیت یہی اجنبی زبان ہے اور لسانی اعتبار سے تو اس کی بڑی اہمیت ہے۔ علاوہ بریں مرتب نے بابائے ریختہ شاہ ولی اللہ دکنی اور ولی الدین احمد آبادی میں کوئی تمیز نہیں کی۔

دیوانِ ولی کو ترتیب دیتے وقت میرے پاس چھ مختلف نسخے تھے جن میں سے کئی اچھی حالت میں تھے اور میں نے ان کے چربے بھی اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ بعد ازاں میں نے چار مختلف نسخے حاصل کیے جن میں سے ایک لال قلعے کے شاہی کتب خانے کا ہے اور اس پر محمد شاہ رنگیلے کی مُہر ہے۔ یہ نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ ان نئے نسخوں کے مطالعے سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ میں نے جو متن طبع کیا، وہ صحیح ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میرا ایڈیشن صحیح ہے کیوں کہ میں نے انھی

[illegible]

کی فہرست ہے:

اصل	تصرف
کوں	کو
پو	پر
سوں	سے
منیں	میں
نکو	نہ
مجھ	میرے
توں	تو
تجھ	تیرے
وو	وہ
یو	یہ
اُن	اون
مُکھ یا مُنھ	رُخ
سجن	صنم
پاس یا کن	طرف
نگر	ملک
میٹھا	شیریں
نین	نگاہ یا نگار
چمن	گلزار
نیہہ	عشق

(އިނގިރޭސި) ބަސް ބުނެވޭ ގޮތަށް، ކަޔާ ބުނެއްޖެ ހިނގާ ނަމަ
ފޮނުވާ ނަމަ ގޮތަށް، ފޮނުވާ ނަމަ ގޮތަށް ނަގާ

(އިނގިރޭސި) ވެދުނު ގޮތުގެ ސަރަ، ނަމަ ކުރިޔާ ބިޔާ ޝީޓު ކަ
ވެދުނު ގޮތުގެ ބަސްދޭ، ނަމަ ކުރިޔާ ބިޔާ ޝީޓު ކަ

(އިނގިރޭސި) ފޮތުގެ ހުއްޓާ ގޮތަށް ބިޔާ މަޑުމަޑުގެ.
(ހަ) ފޮތުގެ ހުއްޓާ ދެއްކުން ބިޔާ ގޮތަށް މަޑު ފޮތް
ގޮތަކަށް ހުރިހުރި ހަތަރު ބިޔާ ކަރުވާ

ބަރު ގޮ:
ގޮތަކަށް ހުރިހުރި ހަތަރު ބިޔާ ކަރުވާ
ބަރުވި ނަމަ ފޮތް ޝަރުކާ

ކަރު ހަމަ ޖަރު ބިޔާ އިނގިރޭސި:
ބަރުވި ނަމަ ފޮތް ޝަރުކާ

ކަމަސަ ވަ ގަ:
ހަ، ނަގަ، ބަރު، ގޮ، ހުރި، ހަރި، ޝަރު،
ބިޔާ ކަރު ގޮތަށް ހަމަ ގަ ތަ ނަމަ ހަދާ ހަރު
ކަ ބިޔާ ވަރުދަ ބަރު ގޮ، ވަރަށް ހަދާ ހަރު ކަ ބިޔާ ހަރު
ހަމަ ހަރު ފަރުގެ ބަރު ގޮތަކަށް ހަމަ ހަމަތަ ހަމަ ނަގަ
ހަރުކަ ހުރިހުރި ހަތަރު ބިޔާ ހަދާ ބަރު، ކަރު ހަމަ ހަ ބަރު ގޮ
ނަގަ ހަމަ ކަރުހަރު ހަމަކަ ހަރު ކަމުވަ ހަމަ ތަ ކަރު ގަދަ
ހަ ކަރުހަ ފަރު ގޮތް ހިޔާކަ ވަރު ހަމަ ހަދަ ކަރު ނަގަ
ހަމަ ބަރުވެ ބަރު.

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہندستانی زبان اور ادب ۱۸۷۶ء میں

(۱)

گوکہ ملکۂ انگلستان نے سرکاری طور پر 'قیصرِ ہند' کا لقب اختیار کر لیا ہے لیکن ان کی قوم کو یہ خطاب ناپسند ہے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ اس قسم کے القاب نیپولین کی مطلق العنانی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یوں تو اہلِ ہند نے ۱۸۵۸ء کے بعد جب ان کے ملک کی عنانِ حکومت براہِ راست فرماں روائے برطانیہ کے ہاتھ آگئی اُسے بلا تکلف قیصرِ ہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ بہر کیف انگریزوں کی خوش نودی کے لیے اس پُر جلال خطاب سے پہلے 'ملکہ' کا لقب آئے گا اور یہ اس ترتیب کے برعکس ہے جو نیپولینِ اوّل نے اختیار کی تھی۔

اس نئے منصب کا اعلان بڑے تزک و احتشام سے سالِ آیندہ کی یکم جنوری کو وائس رائے کی موجودگی میں شاہ جہان آباد کے دربار میں ہوگا۔ یہ وائس رائے لارڈ لٹن ہیں جو پیرس میں برطانوی سفیر رہ چکے ہیں۔ وہ مشہور ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پرتگال میں برطانوی ایلچی کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ حکومت نے انھیں ہندستان کا گورنر جنرل نام زد کیا۔

انگریزی جریدوں کی طرح ہندستانی اخباروں نے بھی شاہی لقب کی اس تبدیلی پر آزادانہ رائے زنی کی ہے لیکن ان کی دلچسپی کا مرکز یہ ہے کہ ہندستانی رئیسوں کے منصب پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ چناں چہ اودھ اخبار لکھتا ہے کہ[۱] "ملکہ کو شہنشاہ کا نام دینے کے بعد یہ لازمی ہے کہ سربرآوردہ والیانِ ملک مثلاً نظامِ دکن کو بادشاہ کہا جائے اور اسی نسبت سے دوسرے راجاؤں اور نوابوں کے خطاب بدل دیے جائیں۔"

ملکہ کے قیصرِ ہند بن جانے کے بعد امیرِ کابل اپنے کو بادشاہ کہلانے کے فکر میں ہیں[۲]۔ اس امر میں انھوں نے شاہی جرگے سے مشورہ بھی کیا اور اس نے امیر کی خواہش پر صاد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ برما کا راجا اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہے کیوں کہ اسے زارِ روس، قیصرِ جرمنی اور ملکہ انگلستان سے گھٹیا ہونا منظور نہیں[۳]۔

صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ برطانیہ، فرانس اور فی الواقع ساری دنیا کے اخباروں نے شہزادۂ ویلز کے سفرِ ہند کا حال بالتفصیل شایع کیا ہے لہٰذا میں اُسے دُہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ چند خاص واقعات کا ذکر نامناسب نہیں۔ کلکتہ یونی ورسٹی کے ایک اجلاس میں شہزادے کو ڈاکٹر کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ امرت سر میں انھوں نے عیسائی مشن کے ناظم مسٹر بیرنگ کے ساتھ

۱؎ ۱ مارچ سنہ ۷۶ء

۲؎ علی گڑھ اخبار ۱۶ مئی سنہ ۷۶ء

۳؎ علی گڑھ اخبار ۲ جون سنہ ۷۶ء

Indian Mail

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] Indian Mail [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

عرصۂ دراز تک انگلستان میں رہ چکے ہیں اور وہاں ملکہ کے حضور میں کئی مرتبہ پیش ہوئے تھے۔ کسی موقع پر شہزادۂ ویلزستھے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ چناں چہ ولی عہد نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں جب ان کی بابت گورنر بنگال سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ بہار میں انسپکٹر مدارس ہیں۔

دلّی گزٹ کے حوالے سے اودھ اخبار نے لکھا ہے:[1]

کلکتہ کے قیام کے زمانے میں شہزادے نے شاہِ اودھ واجد علی شاہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے جواب میں شاہِ اودھ نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ مجھے بادشاہ سمجھتے ہیں تو یہ میرا مرتبہ نہیں کہ آپ کے گھر آؤں۔ لیکن آپ کی نظر میں اگر میں ایک غریب الوطن فقیر ہوں تو پھر میرا منھ کہاں کہ آپ کے رۂوبرۂو آسکوں۔ کہتے ہیں کہ شہزادہ اس جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ خود واجد علی شاہ سے ملنے گیا۔ دورانِ گفتگو میں اس نے وعدہ کیا کہ ان کی سفارش ملکہ سے کرے گا۔ چلتے وقت شاہ نے ہیرے موتی سے جڑی ہوئی ایک جریب نذر کی۔ اس ملاقات سے لوگوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ شاید اودھ کا تخت واجد علی شاہ کو واپس مل جائے گا۔ اودھ اخبار لکھتا ہے: "اس قسم کی افواہ بے بنیاد ہے اور اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے"۔ بہ ہر حال اس کے بعد حکومت نے شاہِ اودھ کے بڑے لڑکے کو پندرہ روز کے لیے لکھنؤ جانے کی اجازت دی۔ اسٹیشن پر شہر کے رؤسا ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ لکھنؤ میں وہ اپنی پھوپھی کے گھر ٹھیرے۔[2]

---

[1] ۱۸ فروری ۶۶ء [2] Indian Mail ۲۸ اگست ۶۶ء

اس سفر میں شہزادے کو جو بیش قیمت تحفے تحائف ملے ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہی۔ یہ راجا روی ورما کی بنائی ہوئی تصویر ہی جس میں ایک ہندستانی لڑکی بین بجا رہی ہی۔ بہت سے نایاب تحفوں کے ساتھ مہارا جا ٹرادنکور نے یہ تصویر بھی شہزادے کو دی تھی۔ اس کا شمار ہندستانی آرٹ کے شاہ کاروں میں ہوتا ہی اور مدراس کے فنونِ لطیفہ کی نمایش میں اس پر انعام ملا تھا۔[1] دو سال بعد پیرس میں جو نمایش ہوگی اس میں شہزادۂ ویلز نے ہندستانی صنعت کے ان سب نادر نمونوں کو بھیجنے کا وعدہ کیا ہی۔ اس لیے ہم بھی انھیں ایک نظر دیکھ سکیں گے۔

اکثر ہندستانی اخباروں نے اس شاہی سفر کو جی بھر کر سراہا ہی۔ لیکن بعض مخالفوں نے جن میں بمبئی کا راست گفتار بھی شامل ہی، لکھا ہی کہ رئیس شاکی ہیں کہ ان سے ان کے شایانِ شان سلوک نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں اودھ اخبار نے "کیا ہندستانی رعایا انگریزی حکومت سے خوش ہی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہی۔ میں اسے جستہ جستہ نقل کرتا ہوں تاکہ ہندستانی اخبار حکومت کی جس پیرایے میں مخالفت کرتے ہیں، اس کا علم آپ کو ہو جائے: "اس سوال کا جواب زبانِ حال سے ہوگا یعنی ہماری حالت سے ہمارے دل کا حال معلوم کر لیجیے۔ ہر چیز کا ظاہر بھی ہوتا ہی اور باطن بھی، ہماری ظاہری حالت کا اندازہ حکومت درباروں میں لگاتی ہی جہاں ہم سے پوچھا جاتا ہی کہ کیا تم مطمئن ہو۔ جواب میں ہاں کہتے

[1] علی گڑھ اخبار ۱۱ فروری سنہ ۷۶ء

کے سوا کیا چارہ ہی۔ لیکن دل کا حال اللہ بہتر جانتا ہی۔ اس سے تو یہی آواز نکلتی ہی کہ ہم اس حکومت سے مطمئن نہیں کیوں کہ اسے ہماری بہت سی ضروریات کا خیال نہیں۔ یہ حکومت نہیں جانتی کہ ہم ایشیائیوں کو کس طرح عافیت مل سکتی ہی۔ حکومت کو ہماری خوش حالی کا فکر ہونا چاہیے۔ آدمی کا دل تبھی سیر ہوتا ہی جب اس کی خواہش پوری ہو۔ شہزادۂ ویلز کو ہی لیجیے جو ایک بہت بڑی سلطنت کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ مطمئن ہیں کیوں کہ ان کے اشارۂ چشم پر سب کچھ حاضر ہی۔ ان کی خاطر میں ہندستان نے ہُن کی بارش کر دی اس لیے وہ جتنے بھی محظوظ ہوں کم ہی۔ لیکن ہندستانیوں کی اس مہمان نوازی کو اُن کے قلبی اطمینان پر محمول کرنا غلط ہوگا۔ شہزادے کو خوبیوں کا سرچشمہ کہ لیجیے لیکن اس سے ہندستانیوں کو کیا۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ حکومت کو ہمارے کروڑوں اہلِ وطن کی بہبودی کا کوئی خیال نہیں جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں تو انھیں اطمینان کس بات کا ہونے لگا؟ زبان سے وہ کچھ بھی کہیں لیکن زرا ان کے دل سے پوچھو۔ یہ دوسری بات ہی کہ اپنی روایت کے مطابق ہندستانی قناعت کر لیں اور ہر حال میں توکّل کا وِرد کرنے لگیں۔ لیکن اطمینان انھیں ہرگز نہیں — کیا اس کی وجہ یہ ہی کہ ہم غیر ملکیوں کے تابع ہیں؟ صرف یہی بات نہیں۔ عیسائی ہوں یا کوئی اور ہندستانیوں کو تو اپنے پیٹ سے مطلب ہی۔ ان پر تو وہ مثل صادق آتی ہی کہ پیٹ بھر دو خواہ بعد میں جوتے مارلو۔

ہندستانیوں پر صدہا سال سے پردیسی حکومت کرتے آتے ہیں۔

کم از کم ڈیڑھ سو شعرا نے تو ضرور طبع آزمائی کی ہے جن میں سے آٹھ کو اودھ اخبار نے خاص طور پر سراہا ہے۔ ان میں سے چار نظمیں انگریزی کی ہیں اور باقی ایک ایک ہندستانی، سنسکرت، بنگالی اور تلنگو کی۔ ہندستانی کا قصیدہ حیدر علی کا لکھا ہوا ہے اور ان حضرات نے مدح سرائی میں مبالغے کی انتہا کر دی۔ ان کے لیے ولی عہد بہادر افلاطون سے زیادہ عاقل اور ارسطو سے زیادہ فاضل ہیں۔ ان کا دل سمندر سے زیادہ وسیع ہے اور ان کے قدموں کی خاک آسمان کی خبر لاتی اور ابرِ رحمت بن کر برستی ہے!

اس شان دار سفر کے بعد کئی معزز ہندستانیوں کو یورپ جانے کا شوق ہوا۔ ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر سر سالار جنگ وزیرِ اعظم مملکتِ نظام ہیں۔ انگلستان آتے جاتے ہوئے وہ چند روز کے لیے پیرس میں بھی رکے تھے۔ وہ اپنی معاملہ فہمی اور بردباری کے لیے مشہور ہیں اور انھوں نے انگریزوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ انھی کا اثر تھا کہ نظام نے برار کا زرخیز صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ حیدرآباد ریاست کے انتظام کو درست کرنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے[1]۔ غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں حیدرآباد میں بد امنی کا بڑا اندیشہ تھا۔ باغیوں نے ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا تھا اور انگریزوں کا طرف دار سمجھ کر سر سالار جنگ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ [illegible] انھوں نے بڑے تدبر سے اس ہنگامے کو فرو کیا۔ ریاست میں امن قائم کرنے کے بعد انھوں نے انگریزوں کی جو فوجی مدد

[1] یہ صحیح نہیں (ایڈیٹر)

بسم ... الله

Passenger

Cold , oil Galligan ;

[illegible]

Monier Williams

[illegible]

کا سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ہندستانی کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ میں تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ اس حد تک قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اسے جانے بغیر کوئی عوام کی بات نہیں سمجھ سکتا؟

پادری (Caldwell) کالڈویل نے لکھا ہے[ل] کہ اگر ملک میں صرف ہندستانی کا ہی استعمال ہونے لگے تو مشنریوں کو بڑی آسانی ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے فی الحال اس کا امکان نہیں انگریزی، سنسکرت اور فارسی کے علاوہ درجنوں صوبہ جاتی زبانوں کا چلن ہے۔ تاہم ہندستانی کم و بیش ہر جگہ سمجھی جاتی ہے اور شمالی و متوسط علاقوں کی تو وہ مادری زبان ہے۔ یہاں تقریباً دس کروڑ انسان آباد ہیں۔ غیر ممالک میں انجیل کی اشاعت کرنے والی سوسائٹی[ٹ] نے اپنی پچھلی رپوٹ میں ہندستان کا ایک لسانی نقشہ درج کیا ہے۔ اس میں بھی اس امر کی تصدیق ہے کہ ملک کے اکثر حصوں میں ہندی یا اُردو کا رواج ہے۔ اور بہ قول پادری کالڈویل گو کہ ہندی اُردو کا اختلاف بڑھتا جاتا ہے لیکن دونوں میں برائے نام فرق ہے۔ اُردو وہ ہندی ہے جس میں فارسی و عربی کے الفاظ کی بہتات ہے۔

اب انجمن عرب سرائے (دہلی) کے سکریٹری لالہ فقیر چند کا ایک مضمون ہندستانی زبان پر ملاحظہ ہو جو کہ 'پنجابی' ربابت الملح

ل Languages of India صفحہ ۴

یہ عجیب بات ہے کہ پادریوں نے کافی اصلاح کے بعد جو رومن رسم الخط رائج کیا ہے ملک والے نہ اسے جانتے ہیں اور نہ اس کی قدر کرتے ہیں۔

ٹ Society for the propagation of Gospel in Foreign parts

سالِ رواں) میں چھپا ہے: "اکثر انگریزوں کی رائے ہے کہ ہندستانی صحیح طور پر اپنی زبان نہیں جانتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کی خوبیوں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ان کے عالم عربی، فارسی یا انگریزی کے مطالعے میں اپنی صلاحیت صَرف کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ دوسری زبانوں کا مطالعہ سودمند ہے یا بے سود۔ ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ ہماری زبان دنیا کی سب سے مہذب زبان ہے۔ اور یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے بے خبر اور اس کی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ یہ رویّہ قابلِ ملامت ہے کیوں کہ ہر انسان پر اس کی زبان کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری انجمنِ لسانیات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور ہماری مطبوعات میں صحتِ زبان کا بڑا خیال کیا جاتا ہے۔ دوسری انجمنیں اپنی اپنی ڈگر پر چلیں لیکن ہم زبان کی خدمت کے لیے وقف ہیں...."

میں نے پچھلے مقالے میں بیان کیا تھا کہ بہار کی عدالتوں اور دفتروں پر ہندی کے حملے کو اُردو نے روکنے کی پوری کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانسہ پلٹ گیا اور بازی ہندی کے ہاتھ رہی۔ بہار ہیرلڈ کے جس مضمون کا حوالہ علی گڑھ اخبار (۲۱ نومبر ۱۸۸۱ء) نے دیا ہے، اس سے تو یہی بات نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سر کیمبل کے اشارے پر حکومتِ بنگال نے ہائی کورٹ کو ہدایت کی ہے کہ عدالتوں میں ہندی کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ یہ بھی کہا ہے کہ ہندی میں لکھی ہوئی درخواستوں کو منظور کرنا چاہیے اور صرف عام بول چال کی زبان کا استعمال ہونا چاہیے۔ ہائی کورٹ نے اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے توسط سے اشتہار دیا ہے کہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے اور انھیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔[1]

مصنفوں اور شاعروں میں ہندی اُردو کا باہمی تنازع نہیں ہوتا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ راجا شو پرشاد نے ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ جن لوگوں نے دونوں زبانوں کی خدمت کی ہے ان کے حالات میں اپنی کتاب "ہندستانی ادب کی تاریخ" میں درج کر چکا ہوں۔ ان میں پالن پور کے نواب زادہ آغا محمد سکندر خاں کا نام نہیں آیا جن کی صفات پر اودھ اخبار (۲۸ جنوری سنہ ۶۶ء) نے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ہندی میں ہوئی اور اس زبان میں انھوں نے چوپائی اور دوہے لکھے۔ پھر موسیقی اور مصوری کا شوق ہوا اور ان فنوں میں انھوں نے بڑا کمال حاصل کیا۔ بعد ازآں اُردو و فارسی کی طرف رجوع ہوتے اور بلا تکلف اُردو میں شعر کہنے لگے۔ غرض کہ ان کی طبیعت ہر مضمون میں حاضر ہے۔ حتیٰ کہ تاریخ و طب سے بھی خاص شغف ہے۔

مغرب کی تقلید محض طرزِ انشا تک ہی محدود نہیں بلکہ تحریر میں بھی اس کا اثر دیکھا جاتا ہے۔ اودھ اخبار کا بیان ہے: "اُردو کی بعض کتابوں اور اخباروں میں رومن رسم الخط کے اوقاف کا استعمال ہونے لگا ہے۔ اب کاتب کا قصور ہے یا ناظر کی جہالت اور یا مضمون نگار کی کم فہمی ــــ ان علامات کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور لوگ انھیں کیڑے مکوڑے کہتے ہیں۔ اس

[1] ۱۴ نومبر [illegible]

میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ علامات صاف لکھی ہوئی ہوں اور ان کا مفہوم آسانی سے سمجھ لیا جائے تو اس سے فائدہ ہوگا لیکن جب تک ان اجنبی علامات کو باقاعدگی اور صفائی سے لکھنا اور سمجھنا نہ آجائے مطلب کے خبط ہونے کا خطرہ ہے اور فائدے کی بجائے سراسر اُلٹا نقصان ہے۔"

دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں میں جو رقابت چلی آتی ہے اس کے متعلق اودھ اخبار نے لکھا ہے کہ:[1] "بہت سے بے خبر نقاد پوچھا کرتے ہیں کہ کیا دہلی میں شعر و ادب کا اب بھی چرچا ہے۔ ان کی نظر میں وہاں اب کوئی نامور ادیب یا شاعر نہیں رہا۔ یہ معترض طعنہ زن ہیں کہ وہ اُردوئے معلا کیا ہوئی۔ ہماری رائے میں یہ نکتہ چینی بالکل بے جا ہے..... ماننے کی بات ہے کہ زمانۂ حال کے بہت سے عالم اور شاعر مثلاً غالب، ذوق، ظفر، صہبائی، مفتی صدرالدین اس محفل سے سدھار گئے۔ جو رہ گئے ان کے ساتھ دنیا نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا....... ہم یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ لکھنؤ کو جن لوگوں پر ناز تھا ان میں سے اکثر حال ہی میں ہم سے بچھڑ گئے۔ دہلی کی خفتہ روح از سر نو بیدار ہوئی ہے اور اس شہر کی ادبی مجلس میں وہی پرانی سج دھج نظر آتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کیوں کہ بہت سے حضرات اس شہر کی تباہی سے قیاس کرتے ہیں کہ اس کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب دہلی کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور تھی اور اس کے دم سے سارے

[1] ۱۲ نومبر ۶۸ء

ہندستان میں تہذیب و ترقّی کی مشعل روشن تھی۔ دہلی اُردو زبان کی ٹکسال تھی اور شاعری کے فن میں اس کا پایہ سب سے بلند تھا۔ نثر کو لیجیے تو اس وقت دہلی میں ایسے ایسے مصنّف ہیں جن کی شہرت ملک بھر میں ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام سُنیے: میرزا غالب کے عزیز خواجہ امن مترجم بوستانِ خیال، علی گڑھ کالج کے بانی سیّد احمد خاں مصنف آثار الصنادید، مولوی نظیر احمد مصنّف توبۃ النصوح، مرآۃ العروس، بنات النعش۔ منشی محمد ذکاء اللہ مصنّف تاریخِ ہند۔ پروفیسر محمد حسین آزاد پروفیسر عربی و مصنّف تصانیف متعدّدہ، مولوی محمد مظہر اللہ صاحب مظہر المضامین، نواب ضیاء الدین احمد خاں مصنّف سلّم الثبوت اور نواب علاء الدین احمد، مولوی ضیاء الدین اور پروفیسر رام چند، مولوی نصرت علی۔ یہ فہرست نامکمل ہے کیوں کہ دہلی کی ہر گلی بڑے بڑے عالموں سے بھری پڑی ہے۔ میں ڈاکٹر محمود خاں، ڈاکٹر محمد سلیم خاں، منشی محمد فخر الدین، مولوی الطاف حسین، میرزا قربان علی بیگ اور مولوی نجف علی مؤلف شرح مقاماتِ حریری جیسے مستند عالموں کو فراموش نہیں کر سکتا جن میں سے ہر ایک نے زبان کو ترقّی دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے طب، ادب یا شاعری کے شعبے میں سیکڑوں آدمیوں کو متاثّر کیا ہے۔ لہٰذا یہ تعصّب کس قدر افسوس ناک ہے کہ ہماری ادبی مجلسوں میں دہلی کے مرتبے کو کم کر کے دکھلانے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔ دہلی کی جن تصانیف کی اشاعت تمام ملک میں ہو رہی ہے انھیں قابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا اور اس کے صدہا

شاعروں میں سے بمشکل دو چار گھٹیا شخصیتوں کا نام لیا ہے"۔

مشرقی ادب کی بدعتوں میں 'سرقہ' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مورخ اور شاعر بلا تکلف دوسروں کی چیزوں کو بے ڈکار لیے ہضم کر جاتے ہیں۔ سرقہ کے متعلق قواعد بھی منضبط کیے گئے ہیں۔ کھلی ہوئی ادبی چوری ممنوع ہے لیکن پردے پردے میں ہاتھ صاف کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ چناں چہ ایسی غزلیں بھی ہیں جنھیں دو شاعر اپنے نام سے منسوب کرتے ہیں اور حقیقت کا فیصلہ محال ہے۔ اس قسم کی ایک مثال اودھ اخبار سے نقل ہے جس کے مضمون کا عنوان ہے۱:

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"!

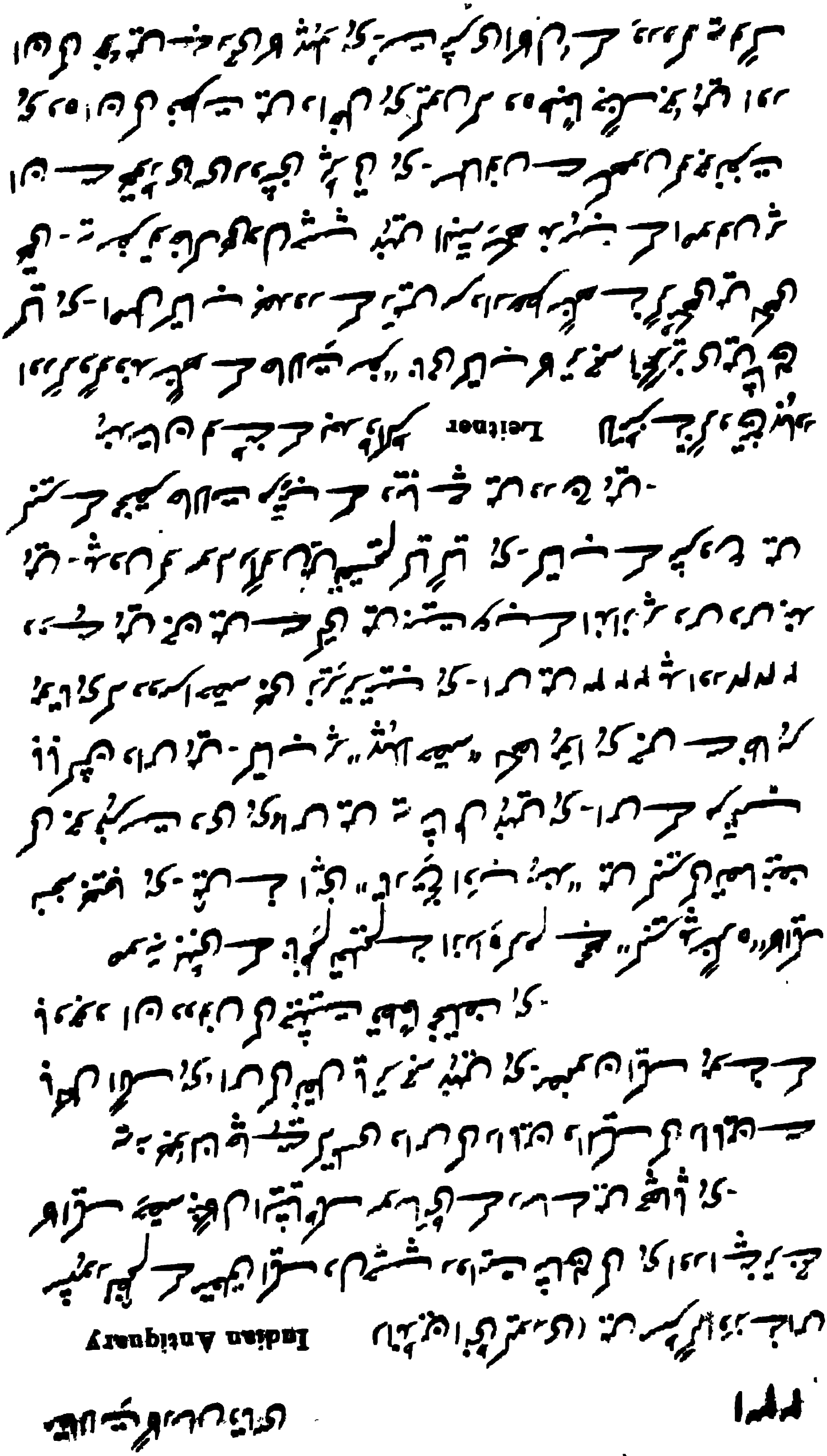
منشی طفیل احمد غافل نے کندن لال گوہر بدایونی پر الزام لگایا ہے کہ ان کا کلام آخر الذکر صاحب نے اپنے نام سے چھاپ ڈالا۔ حضرت غافل کے ہاتھ یہ مسروقہ دیوان لگ گیا اور انھوں نے بدایوں کی عدالت میں گوہر صاحب پر نالش ٹھونک دی۔ شاعروں میں اس معاملے کا بڑا چرچا ہوا لیکن فیصلہ آسان نہ تھا۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کلام غافل کا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی گم نام شاعر بڑے بڑے استادوں کا کلام چرا کر سستی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ کہ کسی کا قصیدہ چرا کر کوئی مفروضہ شاعر امیروں سے انعام وصول کر لیتا ہے اور اصلی شاعر بے چارا منھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

محرم ہندستان میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور اسی زمانے میں نئے مرثیے سننے میں آتے ہیں۔ اودھ اخبار اس تیوہار کا

۱ ۲۴ نومبر ۷۵ء

بیان ان الفاظ میں کرتا ہے: "چہلم کا چل چلاؤ ہے۔ شام کے وقت نواب ممتاز الدولہ کا تعزیہ نہایت تزک و احتشام سے کربلا پہنچا۔ لوگوں کی وہ بھیڑ تھی کہ تل رکھنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ہر طرف قمقمے روشن تھے اور رات پر دن کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہاتھی پر ایک شاندار تعزیہ رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ گھڑسواروں اور پولیس والوں کا مجمع تھا۔ ان کے بعد دُلدُل کا جلوس تھا جس کے ساتھ سوزخواں اور نواب صاحب کے اعزا و اقربا تھے۔ عیش باغ سے لے کر کربلا تک پالکیوں اور سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ماتم کرنے والوں کے ساتھ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ایسا نظارہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔"

اس موقع پر جو مرثیے پڑھے گئے وہ زیادہ تر دبیر مرحوم کے تھے۔ ان کا سارا کلام دو حصوں میں شایع ہو چکا ہے۔ یہ اعلان کرتے ہوئے اودھ اخبار لکھتا ہے: "اس معجز سخن کی ستایش کس سے ہو سکتی ہے۔ میرزا دبیر تخیل کے بادشاہ اور طرز کے نبی تھے۔ ان کا ہر مرثیہ اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ قیامت تک ایسا شاعر پیدا نہ ہوگا اور زمانہ اس کا نام حیرت و احترام سے لیا کرے گا۔ جس طرح سحبان عربوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی گرم گفتاری کا گرویدہ بنا گیا اسی طرح میرزا دبیر کی جادو بیانی اردو میں یادگار رہے گی اور ہندستان کو خصوصاً لکھنؤ کو انھیں حیات نو دینے پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ کون ایسا سنگ دل ہے جو اُن کے مرثیے کو پڑھ کر آنسو نہ بہائے۔ اگر عربوں کو امرالقیس اور متنبی پر ناز ہے تو ہمارے دبیر اور انیس ان سے بیٹے نہیں۔



Leitner

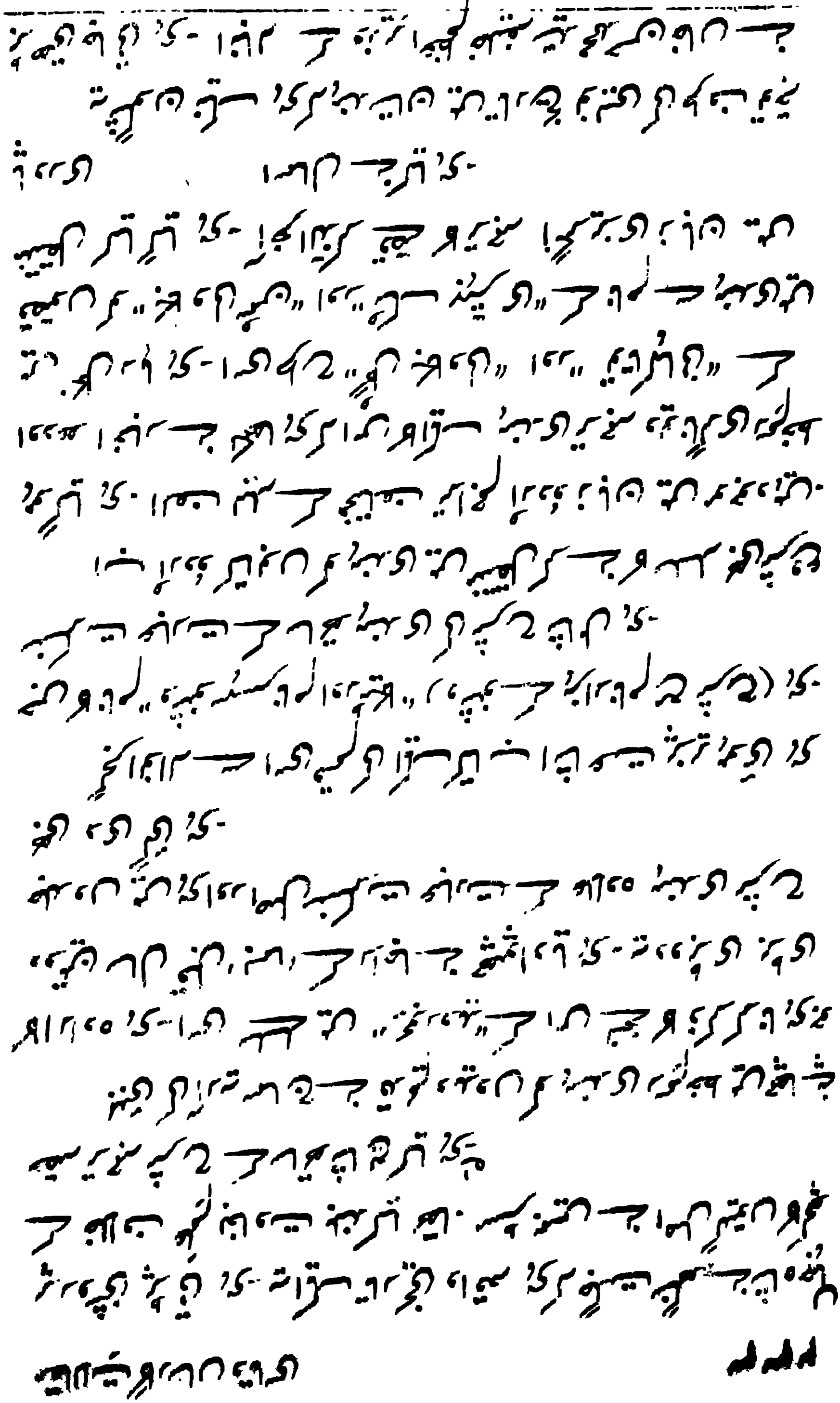
Indian Antiquary

گنگا اشنان کی طرح متبرک تصور کرتے ہیں۔

مواعظِ حیدریہ کے نام سے مولوی غلام حیدر خاں نے کانپور سے ایک کتاب شایع کی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر سادہ اور صاف ہے اور اس میں جو اصول بیان کیے ہیں وہ مذہب و ملت کی قید سے آزاد ہیں اور سب کے لیے یکساں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ... بُہلر کو کشمیر میں ہندی کے شاعر چند بردائی کی رزمیہ نظم "پرتھوی راج راسو" کا ایک قلمی نسخہ دست یاب ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ نسخہ اُن لوگوں کو مستعار دیا جائے گا جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی نگرانی میں Bibliotheca Indica سیریز میں اس نادر کتاب کو چھاپنا چاہتے ہیں۔ ان کے علاوہ لندن میں دو نسخے اور ہیں جو حسبِ ضرورت مقابلے کے لیے مل سکتے ہیں۔ ہندیات سے دل چسپی رکھنے والوں کی خواہش ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی جلد اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچائے اور اس کے تاریخی و لسانی پہلو پر ضروری معلومات فراہم کرے۔ اُدھر سکھوں کے "آدی گرنتھ" کے ترجمے کا کام ڈاکٹر ٹرمپ Dr. Trumpp نے اپنے ذمّے لیا ہے۔ اس کے آٹھ سو صفحات (مع مقدمہ) طبع ہو چکے ہیں۔

مسٹر بیمس Beames ایک پرانے ہندی بھاٹ کو منظرِ عام پر لائے ہیں جس کے متعلق اب تک کم از کم یورپین تو کچھ نہ جانتے تھے۔ یہ سنہ ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ نورپور میں رہتا تھا اور اس کے کلام کا مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۱۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سب گیت راجا جگت سنگھ کی تعریف میں ہیں اور ان سے اس زمانے کے حالات



اپنی ریاست کی مکمل تاریخ لکھنے کا تہیّہ کیا ہے۔

ابن خلدون کی مشہور تصنیف "عنوان العیار" کا ترجمہ عربی سے اُردو میں ہو گیا ہے۔[1] سید مہدی علی حیدرآبادی نے اس کتاب کا خلاصہ اس طرح کیا ہے: "فاضل موّرخ نے سب سے پہلے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ تاریخ میں حقیقت کی شناخت کا طریقہ کیا ہے۔ پھر اپنی کتاب کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں جغرافیہ اور دوسرے میں وحشی قبیلوں کا بیان ہے۔ تیسرے میں خلافت وسلطنت، چوتھے میں تمدّن، پانچویں میں صنعت وحرفت اور آخری میں جملہ علوم کا ذکر ہے۔ ہر حصّے میں مختلف ابواب ہیں۔ پہلے حصّے کے ابتدائی باب میں انسان کی اقسام، اس کے مذاہب اور اس کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر زمین کے مختلف حصّوں، ندیوں، پہاڑوں وغیرہ کا بیان ہے۔ دراصل یہ نزہت المشتاق مصنفہ علوی ادریسی حمودی کا خلاصہ ہے جو جزیرہ سسلی کے بادشاہ ' روجر ' کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس وجہ سے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں۔ بعدازآں ابن خلدون کی بحث کا موضوع یہ ہے کہ رنگ اور عادات پر ہوا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رنگ پر محض سورج کا ہی اثر نہیں ہوتا اور اس سلسلے میں وہ قطبِ شمالی کے باشندوں کی مثال دیتا ہے جو سورج سے بہت کم دو چار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود رنگت کے پھیکے ہیں۔ رنگ پر غذا کے اثر کو بھی وہ تسلیم نہیں کرتا کیوں کہ چینی اور جاپانی وہی کھاتے ہیں جو ہم تاہم زرد رو ہیں۔ ابن خلدون کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے

[1] اودھ اخبار ۱۴ جنوری سنہ ۷۶ء

کہ رنگ وراثت میں ملتا ہی اور نسلاً بعد نسلٍ چلتا ہی۔ یہ کوئی کلیہ نہیں کیوں کہ جو پرتگالی عرصۂ دراز سے سیلون میں بس گئے اب ان کی رنگت سفید نہیں رہی۔ یہی حال امریکہ کا ہی۔ جہاں بہت سے یورپین النسل سنولا گئے۔ ان سب باتوں سے ابن خلدون نے یہ نظریہ قائم کیا ہی کہ ہوا انسان کے رنگ کو متاثر کرتی ہی۔ یہی وجہ ہی کہ پہاڑوں کی صاف ہوا میں رہنے والے میدان کے باشندوں کی بہ نسبت گورے ہوتے ہیں۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں کا مقابلہ دوآبہ والوں سے کر لیجیے۔ ابن خلدون کا دوسرا نظریہ یہ ہی کہ جن علاقوں میں کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں وہاں کے رہنے والے زیادہ مہذب اور امن پسند ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے ملک بنجر ہوتے ہیں۔ ثابت یہ ہوا کہ مادّی دنیا پر ان چار چیزوں کا اثر فیصلہ کن ہوتا ہی:

(۱) مٹّی (۲) پانی اور ہوا (۳) غذا (۴) قدرت۔

جن ملکوں کی آب و ہوا اچھی ہی وہاں کے باشندے صحت مند، مضبوط اور ذہین ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت اور محنت سے بنجر زمین کو زرخیز بنا دیتے ہیں۔ یورپ کی ترقّی اس نظریے کی تصدیق کرتی ہی۔ ہندستان میں قدم رکھتے وقت مسلمانوں میں جو دم خم تھا وہ یہاں بس جانے کے بعد نہ رہا اور اب ان میں اور ہندوؤں میں جسمانی اعتبار سے تمیز کرنا مشکل ہی۔ اقوام کے اطوار اور مزاج پر ان اسباب کا جو اثر ہوتا ہی اسے کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ ہندستان کے عظیم الشان پہاڑوں، وسیع دریاؤں اور گھنے جنگلوں نے ہمیشہ انسان کو مرعوب کیا اور یہاں قدرت

[illegible]

[illegible]

Samuel Johnson

[illegible]

کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے۔ پنجابی[1] اس کے متعلق لکھتا ہے کہ:
"نواب صاحب جیسے مستعد حاکم ہیں ویسے ہی جید عالم ہیں۔ اپنا وقت وہ سیر و تفریح میں ضائع نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ رعایا کی بہبودی کے فکر میں رہتے ہیں۔ نظم و نثر میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان صفحات میں ان کے کلام کے جو نمونے شائع ہو چکے ہیں وہ ہمارے قول کی صداقت ثابت کرتے ہیں۔" موصوف نے دو تین سال تک اپنی ریاست کے علاوہ سارے ملک کا دورہ کیا۔ سفرنامے میں انھوں نے شمالی ہند کے تمام بڑے شہروں کا ذکر مسجدوں اور تاریخی مقاموں کے نقشوں کے ساتھ کیا ہے۔

اب میں ہندستانی کی ان نئی مطبوعات کے نام گناتا ہوں جو میری نظر میں کسی نہ کسی حیثیت سے دل چسپ ہیں:

سرابِ عالمِ اسباب: دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ سو صفحوں کی کتاب، بارہ ابواب اور اینگلو انڈین حضرات کے حالات پر مشتمل ہے۔ جانے آخری باب میں نپولین بوناپارٹ کے حالات کیوں ٹانک دیے گئے ہیں۔

فسانۂ عجائب: مثنوی مولانا رومؒ کی شرح ہے۔ اس کا تعلق سرور لکھنوی کے مشہور قصے سے نہیں۔

حالات النبی: کلکتہ سے شائع ہوئی ہے۔ ضخامت تقریباً تین سو صفحات۔ کلکتہ سے مولوی محمد کامل اور منشی عبدالکریم نے مرتب کی ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آں حضرتؐ تک کے پیغمبروں

---

[1] یکم مئی سنہ ۶۶ء

کی تاریخ ہے۔

گیان پردیپ: ایک معجونِ مرکب جو کلکتہ کے پنڈت کشن چند نے ہندی میں لکھی ہے۔

لولی نامہ: دیوانِ ریختی مصنفہ احمدی۔ مسٹر ایڈورڈ بالفور نے مدراس سے شایع کی ہے۔

دیوانِ عالم: مصنفہ نواب محمد حسن خاں عالم کلکتوی۔

گل دستۂ بزم آرا، اُردو نظم مصنفہ فرزند علی۔

شفاء العلیل، شاہ ولی اللہ دہلوی کے عربی رسالے 'قولِ جمیل' کا ترجمہ۔

ابرِ کرم: عشقِ الٰہی سے متعلق روایتوں کی مثنوی۔ کان پور سے شایع ہوئی ہے۔

بابِ نصیحت: بابو رام سروپ کی اخلاقی نظموں کا مجموعہ سہارن پور سے شایع ہوا ہے۔

رتنا ولی ناٹک: ہرش دیو کے سنسکرت ڈرامے کا ہندستانی ترجمہ از پنڈت دیودت الہ آبادی۔

مہابھارت: ہندی نثر میں نیا ترجمہ از کرشن چندر دھرما دھکاری بنارسی۔ تین جلدیں کلکتہ سے شایع ہوئی ہیں۔

پریم امرت، دکن کے ہندو مصلح رامانج کی زندگی کا ڈراما جس کا ہندی ترجمہ بدری داس نے کیا ہے۔

سخاوت نامہ: منظوم فسانہ مصنفہ شاہ رحمان مطبوعہ کان پور۔

تصویرِ غم: نظمِ حکیم اشرف علی حسرت۔

تذکیر الالوان: عمارت سازی پر منظوم کتاب از ریاست علی۔

سیا سویمبر سوانگ: یہ ناٹک ناتھ سنگھ کا لکھا ہوا ہے۔

ست سئی سار: بہاری کے دوہوں کا خلاصہ ہندی نظم میں از چوبے رادھا کشن۔

نقلِ مجلس: از محمد عاشق علی لکھنوی۔

مقاصد الزائرین: از رشاد اللہ۔ کربلا اور عرب کی زیارت کے متعلق۔

معراج المضامین: شیعہ مذہب کے بارہ اماموں کے حالات۔ از اسمٰعیل حسین۔

گل دستۂ خنداں: منشی منور علی کی نظموں کا مجموعہ۔

گلشنِ عشق: شاہ زادہ ماہ لقا اور شاہ زادی حسن آرا کے عشق کی داستان۔ از خواجہ بادشاہ صغیر۔ اسی نام کی کئی اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

منتخب التواریخ: فارسی کتاب کا ترجمہ جو ساڑھے پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ از احتشام الدین۔

تحفۃ العوام: از حاجی حسن علی۔ دوسرا ایڈیشن ہے۔

فصاحت: نظم از محمد حسین جاہ۔

مفید الانشا: از پنڈت شو نارائن۔ مطبوعہ لکھنؤ۔

گل دستۂ تعشق: حسین تعشق کا دیوان۔

دائرۂ علوم طبعیات: بنارس کالج کے پروفیسر لکشمی نارائن کی تصنیف ہے۔ مولوی سید احمد خاں کی فرمایش پر یہ تقریریں کی گئی تھیں اور اخبار پنجابی نے لکھا ہے کہ انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو سامنے رکھ کر انھیں تیار کیا گیا ہے۔

فیض نشان: میرزا والا جاہ عاشق کی غزلوں کا مجموعہ جو لکھنؤ میں چھپا ہے۔

بہارِ اسرارِ حقیقت: تصوّف پر ایک رسالہ ہے۔

گلشنِ فیض: از غلام محمد خاں۔

گنجِ تواریخ: اُردو اور فارسی۔ از عبدالغفور خاں۔

استری درپن: عورتوں کے لیے نصیحت کی کتاب۔ از پنڈت مادھو پرشاد۔

کوی کلا پتر: ہندی انشا کا رسالہ۔ از چیتا منو۔

شمسِ فیض: شاہزادہ شاہ رُخ اور شاہزادی ماہ رُخ کی محبت کی داستان از غلام محمد خاں۔ صفحات ۲۳۶

سنگرہ دیپی: علمِ نجوم پر ہندی میں تفصیلی بحث۔ از پنڈت سوربہ پرشاد۔ صفحات ۵۳۶

اندرجال: گنڈا تعویذ، جادو ٹونا وغیرہ کا بیان۔ از میر حسن مطبوعہ دہلی۔ صفحات ۳۰۴

سامودرک ریکھا: فراست الید پر ہندی میں کتاب۔

تحفۂ طلسمات: از عبدالرسول خاں۔

علمِ طب: از قاضی الٰہی بخش امرت سری۔ اس میں غذا و ہوا، حرکت و آرام وغیرہ پر سیر حاصل بحث ہے۔

تبیین الصنائع: از مولوی محمد الدین۔

معدن الحکمت: اُردو اور انگریزی میں پانچ سو صفحات کا طویل رسالہ ہے جس میں اصطلاحات پر ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔

سیّد غلام حسین نے شایع کیا ہے۔

تہذیبِ احسانی: از حکیم احسان علی۔

مفرداتِ رزاقی: فارسی کتاب مفرداتِ نصیری کا اُردو ترجمہ۔ از حسیب الدین۔

جغرافیۂ طبعی: مدرسۃ العلوم مسلمانان کے لیے منشی محمد ذکاءاللہ نے لکھی ہے۔ اودھ اخبار نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔ مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے فرانسیسی ٹیلر صاحب کی مدد سے میرے ایک مقالے "اُردو شاعری کے تذکرے" کا ترجمہ ہندستانی میں کیا ہے۔

قصصِ ہند: ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے چیدہ واقعات۔ لاہور سے طبع ہوئی۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔

واقعاتِ ہند: ہندستان کی مکمل تاریخ۔ لاہور سے طبع ہوئی۔ حجم ۱۸۰ صفحات۔

کتاب السعادت: اخلاقی رسالہ مصنف محمد اکرام الدین دہلوی۔

بڑھاپا نامہ: از نظیر اکبرآبادی۔ دلّی میں طبع شدہ۔

قصۂ حقیقت رائے: از آگرہ سنگھ۔ ہندی کی اس عجیب و غریب پوتھی میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم کا ذکر ہے۔

جلوۂ توحید: بھگوت گیتا کا خلاصہ۔

کشف الحجاب: نظام الدین صاحب نے پردہ نشینی کے آداب بیان کیے ہیں۔ مدراس میں چھپی ہے۔

بحر الحقیقت: مذہبی نظم ہے۔ کان پور سے شایع ہوئی ہے۔

دیوانِ نیاز: شاہ نیاز احمد کا مجموعۂ کلام جو کان پور سے شایع ہوّا ہی۔

تواریخ امریکہ: لکشمی داس صاحب کی تالیف جو دلّی کی ادبی انجمن کے زیرِ اہتمام شایع ہوئی ہی۔ پہلی جلد میں ڈھائی سو صفحات ہیں جن میں ابتدا سے لے کر کولمبس کی دریافت تک کے حالات قلم بند ہیں۔

لاہور سے حسبِ ذیل کتابوں کے ہندی و اُردو تراجم کی اشاعت کا اعلان ہوّا ہی:

Brain's Mental Science

Fowel's Logic

Taylor's Ancient History

Huxley's Physiology

اُردو اخباروں میں شعر و شاعری کے چٹخارے میں کمی نہیں ہوئی۔ اودھ اخبار نے منشی محمد کا کلام چھاپا ہی۔ یہ صاحب "اللہ یار" تخلّص کرتے ہیں اور آج تک کسی نے ایسا عجیب و غریب تخلّص نہیں رکھا۔ اسی جریدے میں واجد علی شاہ کی دو غزلیں شایع ہوئی ہیں اور انھیں 'بے نظیر' و 'جادو رقم' کا لقب دیا گیا ہی۔ علاوہ بریں منشی غلام محمد خاں 'حرّیت' دہلوی، بھگوان دیال عاقل، منشی سید امیر علی مشہدی اور فرماں روائے رام پور المتخلص بہ نواب کا کلام وقتاً فوقتاً اشاعت پزیر ہوّا کرتا ہی۔ پنجابی میں بھی حصّۂ نظم نمایاں ہوتا ہی۔ محمد حسن نے اس کے لیے انگریزی کی کئی

[illegible]

ہوتا ہی۔ یہ گیت بیاہ اور تیوہاروں کے موقع پر گائے جاتے ہیں اور اپنے ملک کے ادبِ عامہ کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اسی شہر کے مشہور عالم لالہ بہاری لال نے ست سبھا کے لیے بہت سے بھجن لکھے ہیں۔ ان کے مجموعے میں مغربی بدعتوں کے خلاف کئی عام فہم گیت بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

مذہبی کتابوں کی بھرمار کا وہی حال ہی اور اس میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں ہی۔ اس سلسلے میں میں صرف مخصوص کتابوں کا خاکہ دیا کرتا ہوں اور نئے ایڈیشنوں کا تو ذکر ہی نہیں کرتا۔ لیکن بے انصافی ہوگی اگر انجیل کے اس اُردو ترجمے کا نام نہ لیا جائے جو لندن سے شایع ہوا ہی۔ یہ کام پادری میتھر Mather نے کیا ہی جو میرزاپور سے 'رفیقِ ہند' نامی اُردو اخبار نکالتے تھے۔ اس ایڈیشن کی خوبی یہ ہی کہ مشکل حصوں کو سمجھانے کے لیے جا بہ جا نوٹ دیے گئے ہیں۔ ہر باب کے شروع میں دیباچہ ہی جس میں بحث طلب مسائل کی تشریح کی گئی ہی۔ اُردو صحیح اور صاف ہی۔

منشی شجاعت علی نے 'عیسائی ادعیہ' کے نام سے ایک منظوم کتاب شایع کی ہی۔ پادری بینرجی نامی نو عیسائی عالم نے Aryan Witness کے عنوان سے ایک دل چسپ کتاب[1] لکھی ہی جس میں انجیل کی تائید میں ہندو شاستروں سے سند پیش کی گئی ہی۔ رِگ وید سے انھوں نے 'یہووا' کا نام ڈھونڈ نکالا ہی۔ اور میری پڑ روی میں کشن بھگوان اور حضرت عیسیٰؑ کے حالات

[1] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۵ء

میں مشابہت دکھلائی ہو اگر کوئی فرق ہو تو وہ مشرقی مبالغہ آرائی نے پیدا کیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ بینرجی نے 'نارد تیخ ماتر' نامی کتاب کی تاویل یہ کی ہو کہ نارد منی ولایت کی سیر کرنے گئے تھے اور عیسیٰؑ کو 'ہری' کا نام دے دیا۔ ورنہ دونوں کی صفات اور شخصیت میں کوئی فرق نہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی مطبوعات میں سے حسبِ ذیل اہم ہیں:-

تفسیرِ قرآن: بمبئی سے مولوی محمد سلیم نے شایع کی ہو۔

زینت القاری: قرأت کے قواعد جو محمد عنایت احمد نے مرتب کیے ہیں۔ بمبئی میں طبع ہوئی۔

راہِ ایمان: از مولوی محمد جعفر۔ مدراس سے شایع ہوئی۔

اخبارِ ماتم: از محمد حسین۔ معرکۂ کربلا کی تاریخ۔ حجم ۱۲۶۶ صفحات۔

تحریر الشہادتین: حالاتِ کربلا۔ از حکیم ناصر علی۔ مطبوعہ لکھنؤ۔

معراج نامہ: از حاجی قمر الدین۔ یہ نظم لکھنؤ میں چھپی ہو۔

کحل البصر: ولادتِ نبویؐ کا منظوم بیان۔ از محمد عاشق علی آشنا۔

حدیقۃ الاولیا: از غلام سرور لاہوری۔ اس میں دہلی اور پنجاب کے مقتدر علما و اولیا کے حالات کے علاوہ نقش بندی، چشتی وغیرہ سلسلوں کا بھی ذکر ہو۔

قصۂ حلیمہ صادقہ: حلیمہ دائی کا ذکرِ مسعود۔

بہت سے مسلمان عیسائیوں کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھ دار لوگ اسے بُرا نہیں سمجھتے۔ ان میں سے ایک یعنی خان احمد شاہ نے 'اظہارِ حق' کے نام سے

ایک بصیرت افروز رسالہ شایع کیا ہی۔

عام طور پر مَیں ابتدائی کتابوں کے ذکر سے پرہیز کرتا ہوں۔ اس مرتبہ مَیں اس قاعدے کو توڑنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرا یہ اعتقاد ہی کہ بنگال میں ہندستانی کا اتنا ہی چلن ہی جتنا انگریزی یا بنگالی کا۔ اس کے ثبوت میں دو کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہی جو حال ہی میں شایع ہوئی ہیں۔ ایک تو واکیارنب (محاوروں کا سمندر) جو بیک وقت انگریزی، بنگالی اور اُردو میں شایع ہوئی ہی۔ آنند چند مکرجی نے اس کتابچے میں مقبولِ عام محاوروں کو یک جا کر دیا ہی۔ دوسرے پُنیہ کھیتر پرب' (مقدس مقامات) نامی رسالہ جسے چندسین داس نے ہندی، بنگالی اور انگریزی میں شایع کیا ہی۔

مفیدِ عام۔ انگریزی زبان کی نہایت عمدہ گرامر ہی جسے نامور مصنف محمد نصرت علی نے قلم بند کیا ہی۔ حجم ۱۳۲ صفحات۔ طبع شدہ دہلی سنہ ۳ء۔

چھند اور پنگل۔ ہندی عروض پر ایک رسالہ جسے بہاری لال نے لکھا ہی۔

رشحاتِ صغیر۔ صَرف و نحو اور اُردو زبان پر صغیر بلگرامی کا رسالہ۔

مصدر فیوض۔ اُردو میں فارسی گرامر پر رسالہ۔ مؤلفہ نظیر الدین لاہوری۔

احسن القواعد۔ یہ بھی فارسی زبان کی گرامر ہی لیکن اوّل الذکر سے کہیں زیادہ مفصّل اور قابلِ قدر ہی۔ بریلی کے مولوی نجف علی نے تالیف کی ہی۔

قاعدۂ اُردو۔ ہندستانی کی گرامر جو شمس الدین صاحب نے لکھی اور لاہور سے شایع ہوئی۔

فرانسیسی ہندستانی کی پہلی کتاب Petit Manuel Français-Hindostani ڈاکٹر اورلک Aurilac نے لکھی ہی۔ حجم ۱۱۹ صفحات۔

پچھلے سال میں نے ڈاکٹر فیلن کی عظیم الشان ہندستانی ڈکشنری کے پہلے حصّے کے چھپنے کی اطلاع دی تھی۔ اُردو اخباروں نے اس کی از حد تعریف کی ہی۔[1] آج مجھے یہ اعلان کرتے انتہائی مسرّت ہوتی ہی کہ اس کے تین مزید حصّے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پہلے حصّے کا دوسرا ایڈیشن بھی خفیف سی ترمیم کے ساتھ شایع ہوا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ قابل عالم ہمہ تن اپنے کام میں معروف ہی۔ مجھے امید ہی کہ ان کی محنت بہت جلد ٹھکانے لگے گی۔ میری امید اس ہندستانی انگریزی ڈکشنری سے بھی وابستہ ہی جسے میرے عزیز اور لائق شاگرد مو سے M. F. Deloncle تیار کر رہے ہیں۔ میں ان کے کام کی نگرانی کر رہا ہوں اور انھیں کئی اچھے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہی۔

میں نے پادری کیلاگ (Kellogg) کی ہندی گرامر کی تکمیل کا اعلان کیا تھا۔ اب وہ چھپ چکی ہی اور مصنّف نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہی۔ یہ صرف اودھی ہی نہیں بلکہ مارواڑی، کمیل کھنڈی، بھوج پوری وغیرہ ہندی بولیوں کی مجمل گرامر ہی۔ یہ ایک عالمانہ کارنامہ ہی جس میں ان بولیوں کے باریک سے باریک فرق کو وضاحت

[1] مثلاً اودھ اخبار ۲۰ اگست سنہ ۷۴ء

Notes of an Indian Journey

Hoernle

Frederic Pencott

[illegible]

Sir Richard Temple

[illegible]

سلوک کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ نیک نیت اور بدنیت نقادوں میں تمیز ہونی چاہیے: "حکومت کو نیک نیت مبصروں کا احسان مند ہونا چاہیے کیوں کہ وہ آزاد خیالی اور ایمان داری سے جو کچھ کہتے ہیں وہ توجہ کا مستحق ہے بلکہ بدنیت لوگ بھی کبھی کبھی کام کی رائے دیتے ہیں۔ یوں کہیے کہ ہر قسم کی تنقید قابلِ غور ہے۔ بنگال کے گورنر اس نکتے کو سمجھتے ہیں۔ اگر اخبار ہمیشہ حکومت کا دم بھرتے رہیں تو ان میں اور مصاحبوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس صورت میں نہ رعایا کو ان پر بھروسا ہوگا اور نہ وہ ایمان داری سے اپنا فرض پورا کر سکیں گے۔ البتہ اگر وہ غیر جانب دار رہیں اور کسی وقت حکومت کی کسی کارگزاری کی تائید کریں تو ان کی رائے میں اثر ہوگا۔ گورنر بنگال کو یہ دیکھ کر خوشی ہونی ہوگی کہ اہلِ ہند حکومتِ برطانیہ کو پسند کرتے ہیں اور اسے دوسری مغربی حکومتوں خصوصاً حکومتِ روس پر ترجیح دیتے ہیں جو ہندستان کی جانب اپنا اثر پھیلا رہی ہے۔ اس اثر کی وجہ سے ہندستان میں جو گھبراہٹ پھیلی ہوتی ہے وہ گویا راجا اور پرجا کے باہمی اخلاص کی دلیل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کا رویّہ روادارانہ ہے اور اس کے سائے میں ہم رُوحانی، ذہنی اور مادّی ترقی کر سکیں گے۔"

لگ بھگ چالیس سال سے ہندستان میں اخبار نکلتے ہیں۔ اب تو ان کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ (اخباری زبان میں) ہر گلی کوچے اور گھر گھر میں ان کے شائق موجود ہیں۔

پنجابی کا بیان ہے[۵] کہ ہندستانی اخباروں کی تعداد میں روزافزوں

[۵] ۱۳ مئی ۱۸۶۶ء

ترقی ہو رہی ہی۔ اسے اس کا افسوس ہی کہ حکومت پریس پر پابندی لگا رہی ہی اور اپنے عہدے داروں کو مضمون نگاری سے روکتی ہی۔ اس اخبار کا خیال ہی کہ انگریزی جریدوں کے پاس خبر حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں لیکن ہندستانی اخباروں کے محدود وسیلوں کو اور بھی مختصر کرنا نامناسب ہی۔ اگر حکومت کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے انتظام کے متعلق رعایا کیا خیال رکھتی ہی تو اس سے اس کا سراسر فائدہ ہی۔ لیکن اگر پریس آزاد نہ ہو تو یہ کیوں کر ممکن ہی؟ امید ہی کہ عرصے سے ملکی پریس کو جو مراعات حاصل تھیں اب وہ منسوخ نہ کی جائیں گی۔

جامِ جمشید کو شکایت ہی[1] کہ انگریزی کے اخبار اپنے ہندستانی ہم عصروں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ "اپنے زُعم میں وہ اپنے کو عوام کا فیاض گردانتے ہیں اور ہمیں تہِ فضول سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے طعن و طنز کی مطلق پرواہ نہیں۔ اب ہم جہالت اور کاہلی کی گرد جھاڑ چکے ہیں اور بے دھڑک دن کو دن اور رات کو رات کہتے ہیں۔ ہم لوگوں پر یہ جھوٹا الزام ہی کہ حکومت کے مخالف راجاؤں سے روپے لے کر ان کی حمایت کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ نہ تو یہ راجا اخبار پڑھتے ہیں اور نہ ان کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ سچ تو یہ ہی کہ ہندستانی اخبار انگریزی جریدوں سے کسی طرح کم ایمان دار نہیں۔ فرق یہ ہی کہ ہم میں اتنی آزاد خیالی نہیں۔ دونوں میں تیز اور کند تلوار کا فرق ہی۔ بے چارے دیسی راجا تو انگریزی اخباروں سے جتنا ڈرتے ہیں اتنا بڑے لاٹ صاحب سے بھی نہیں۔ اگر ان کے

---

[1] منقول از علی گڑھ اخبار بابت ۱۸ مارچ [illegible]

اعتراضوں کا جواب وہ دیسی پریس کے توسط سے دینا چاہیں تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اب وہ زمانہ بیت گیا جب بڑے لاٹ راجاؤں سے کہتے تھے کہ میں کان پکڑ کر تمھیں تخت سے اُتار دوں گا۔ لیکن انگریزی اخباروں کو پہلے سے ان کا حالِ دل معلوم ہوتا ہے اور وہ راجاؤں کو ڈرا دھمکا سکتے ہیں۔ ان کی دھمکی بے اثر بھی نہیں ہوتی۔ ہندستانی اخبار صرف ان دھمکیوں کا جواب دیتے ہیں..... بہرحال انگریزی کے اخباروں کو ہم سے بھائی چارا برتنا چاہیے اور کشاکش چھوڑ کر ہم سے اتحاد پیدا کرنا چاہیے۔ ورنہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق ہم بھی انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینے پر مجبور ہوں گے"۔

اودھ اخبار کی رائے ہے کہ ہندستان میں مختلف قسم کے اخبار ہیں۔ ایک تو انگریزی جو ہر مغربی خیال اور مصلحت کی تائید کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ دوسرے ہندستانی زبانوں کے اخبار۔ ان سب کا ایک مقصد ہے یعنی وطن کی محبت اور غریب دیس بھائیوں کی اصلاح اور بہتری کا جذبہ۔ حکومت کے بہی خواہ ہوتے ہوئے بھی وہ آزادی سے ہر بے انصافی کی مخالفت کرتے ہیں۔ گوکہ پریس کی آزادی اب بھی محدود ہے لیکن خدا کرے کہ یہ باقی رہے اور اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آئے۔ ہندستانی ایڈیٹر — خواہ وہ اُردو صحیفوں کے مدیر ہوں یا انگریزی فارسی وغیرہ کے — ملک کے ساتھ حکومتِ وقت کی بھی عزت کرتے ہیں اور ان کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انگریزی اخباروں کے اکثر مضمون نگار

لہ ۱۰ مئی ۶۹ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

خلاف آواز اٹھاتے بلکہ اس سینسر کی بھی مخالفت کرتے جو ہماری آزادی کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہے۔ اگر اخباروں کو آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا جاتے تو وہ ملک کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ اگر ہندستان میں اخبار باقی نہ رہیں تو گورمنٹ من مانی حکومت کرنے لگے گی اور کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔ کیا انگریز اس قسم کی پابندیوں کو پسند کریں گے اور ان کا طوق ہماری گردن میں ڈال کر خوش ہوں گے؟ ہمیں تو اب بھی یقین ہے کہ ایسا اندھیر نہ ہوگا اور پریس اپنی آزادی سے محروم نہ کیا جائے گا؟"

ان سب باتوں کے باوجود حکومت دراصل ملکی اخباروں پر تھوڑی سی پابندی عائد کرنا چاہتی ہے۔ کیوں کہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی وہ آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۱؎

کشمیر میں بھی پریس آزاد ہے۔ اس کا اقرار ریاست کے وزیرِ اعظم نے ایک نمایندے سے کیا جسے تحفۂ کشمیر کے کسی مضمون سے شکایت تھی۲؎

مسٹر لائٹنر Leitner کے اس خیال سے ہمیں کامل اتفاق ہے کہ "اگر مشرق میں اخباربینی عام ہو جائے اور ریلوں کا جال بچھ جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ازسرِنو اپنے کھوئے ہوئے مرتبے کو دوبارہ حاصل نہ کر لے۔ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ مغرب کی کورانہ تقلید نہ کرے"

۱؎ Indian Mail ۲۵ ستمبر سنہ ۶۶ء

۲؎ علی گڑھ اخبار ۵ نومبر سنہ ۶۵ء

نئے ہندستانی اخباروں کی فہرست ذیل میں درج کرتا ہوں؛

آئینۂ طبابت: طبی رسالہ جو اُردو اور انگریزی میں زیرِ ادارت شیخ امام الدین اکبرآبادی شائع ہوتا ہے۔

اشرف الاخبار: دلّی کا سیاسی جریدہ۔

بحرِ حکمت: طبّی ماہ نامہ۔ زیرِ ادارت ڈاکٹر رحیم خاں لاہوری۔

بمبئی گزٹ

قاصدِ پٹنہ

فرحت الاحباب: بمبئی کا ہفتے وار اخبار جسے منشی محمد الدین نے نکالا ہے۔

گنجینۂ قوانینِ ہند: ماہانہ رسالہ جو آئین و قوانین کے لیے وقف ہے۔ لاہور سے نکلتا ہے۔

گنجینۂ نظائر: یہ انڈین لا رپوٹ کا اُردو ایڈیشن ہے۔ لاہور سے نکلتا ہے۔

گل دستۂ شعرا: اُردو نظم کا انتخاب جو ہر مہینے لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔

ہندو بندھو: اس مذہبی رسالے کو لاہور کے پنڈت شو نارائن ہندی اور اُردو میں نکالتے ہیں۔

جبل پور سماچار: یہ ماہ نامہ ہندی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔

گیان پرکاش: پونہ کا ہندی اخبار۔

جامع الاحکام: یہ 'ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن' کا آرگن ہے جو لکھنؤ سے مہینے میں دو بار شائع ہوتا ہے۔

کالیستھ دھرم پرکاش: اس میں کالیستھوں کی دھرم سبھا کے احکام مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتے ہیں۔

منبع الاحکام: اس ماہ نامے میں ہائی کورٹ کے فیصلے درج ہوتے ہیں۔

مریادا پری پاٹی سماچار: آگرے کا ماہانہ رسالہ جو ہندی اور سنسکرت میں نکلتا ہے۔

مراسلۂ کشمیر: کشمیری پنڈتوں کا ماہانہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔

مخبر سرور: بمبئی کا ہفتے وار اخبار۔ اسے حاجی مولا بخش کی ادارت کا شرف حاصل ہے۔ حاجی صاحب انگریزی، گجراتی، ترکی، عربی وغیرہ کئی زبانوں کے ماہر ہیں اور ان سے اپنے اخبار کے لیے ترجمے کیا کرتے ہیں۔

نیت پرکاش: اس کا اجرا امرت سر سے ہوا ہے۔ ہفتے وار ہے اور مقصد ہندوؤں میں مذہبی جوش پیدا کرنا ہے۔

پریاگ دھرم پرکاش: ہندی اور سنسکرت کا ماہانہ رسالہ۔

رہبر ہند: جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔

رسالۂ انجمن مذاکرۂ علمیہ: پٹنہ کی انجمن ادب کا آرگن۔

رسالۂ انجمن تہذیب کان پور۔

ریاض الاخبار: خیرآباد سے نکلتا ہے۔

سکل سمبودھنی پترکا: ہندی کا ادبی اور مذہبی ماہ نامہ جو امرت سر کے سنتوکھ سنگھ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

ستیہ مترا: بمبئی کا اخبار۔

تحفۂ کشمیر:

اُردو اکولہ اخبار: اکولہ (برار) سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ پنجابی نے اس کے معیار کی تعریف کی ہے۔

کہیں پڑھنے میں آیا کہ جو ہندو عیسائی ہو گئے ہیں انھوں نے "آرین" کے نام سے انگریزی میں رسالہ نکالا ہے[1] اگر یہ یورپین اور ہندو خیال کے مابین ترجمانی کر سکے تو ایک بہت بڑی کمی پوری ہو جائے۔

قاسم الاخبار: محمد قاسم خاں اس کے مالک اور مدیر ہیں۔

رام پور سے ہر جمعرات کو تاج الاخبار شائع ہوتا ہے۔ سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ آغا علی نقوی غنی اس کے مدیر ہیں۔

دلی کا ناصر الاخبار سرکاری حکام کی خدمت میں مفت حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ شاکی ہے کہ "حکومت اب پہلے کی طرح ہندستانی اخباروں کی مدد نہیں کرتی۔ سر ولیم میور کے زمانے میں ایک ایک پرچے کی سو سو دو دو سو کاپیاں خرید کر افسروں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ حالات سے باخبر رہیں۔ اس مد میں ۲۵ ہزار روپے ہر سال خرچ کیے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ رقم گھٹا کر صرف دس ہزار کر دی گئی ہے۔ چناں چہ اخبار فاقہ زدہ ہو گئے ہیں۔ اگر ہر صوبہ ان کی سو نہیں تو پچاس کاپیاں ہی خرید لے تو ان کا دلدر دور ہو جاتے۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہندستان کے تمام اخبار نویس مل کر بڑے لاٹ بہادر سے درخواست کریں کہ پرانی رسم کی تجدید ہو اور کیوں کہ جہالت پر بہرحال علم کو ترجیح دی جاتی ہے، لہٰذا کیا عجب کہ ان کی عرض سن لی جائے۔ اخباروں کی حالت ان پودوں کی سی ہے جن کی پرورش اگر سلیقے

---

[1] Indian Mail ۱۳ مارچ ۱۸۶۹ء

سے ہو تو وہ موسم میں پھول اور پھل سے باغ بان کو مالا مال کردیتے ہیں"

یہ کہہ چکا ہوں کہ جریدۂ روزگار کا اجرا شہزادۂ ویلز کی آمد کے زمانے میں مدراس سے ہوا تھا۔ اس نے اس تقریب کی مفصل روئداد شائع کی ہے۔ پیشِ نظر نمبر میں ولی عہد کی تصویر دی گئی ہے اور مدراس میں ان کا جو استقبال ہوا اس کا ذکر ہے۔

اودھ اخبار نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال پورے کرلیے۔ ان میں سے چودہ سال وہ ہفتے میں ایک بار اور پھر تین سال ہفتے میں دو بار نکلتا رہا۔ پچھلے سال سے وہ ہر دوسرے روز شائع ہونے لگا ہے۔ اس کے بہت سے قدردان چاہتے ہیں کہ وہ روز نکلا کرے۔ اخبار کے مالک کی بھی یہی خواہش ہے لیکن اس سے پہلے انھیں کم از کم پانسو نئے مستقل خریداروں کی ضرورت ہے۔

منظور احمد صاحب فرخ آبادی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ترکی، مصر، ایران اور ہندستان کے اکثر اخبار میری نظر سے گزرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی اودھ اخبار کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بہرکیف فی الحال تو وہ ہفتے میں تین مرتبہ نکلتا ہے۔ منشی غلام محمد خاں نے از سرِ نو اس کی ادارت اپنے ذمے لے لی ہے۔ وہ پہلے بھی اس کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور ان کی قابلیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

گنجینۂ نظائر کا نام اوپر آچکا ہے۔ ایک نئے فرمان کے بموجب 'ہائی کورٹ' اور 'پریوی کونسل' کے فیصلہ جات اب ایک سالانہ رپوٹ میں جمع کردیے جاتے ہیں۔ قانون پیشہ طبقے کے

مطبع ... کوہ نور پریس لاہور نے اس کا اُردو ترجمہ گنجینہ شائگان کے نام سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ ملک کے آئین قانون سے بے خبر نہ رہیں۔

اشرف الاخبار گو کہ نوزائیدہ ہے تاہم اپنے اعلا معیار کی وجہ سے دلّی کے بہترین اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے مالک اور مدیر محمد میرزا خان ہیں جو اپنی انشا پردازی، تاریخ دانی اور رواداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کا قلم منجھا ہوا اور رائے جنچی تُلی ہے۔

(۳)

اہلِ ملک نے تعلیم کے میدان میں ایسی ترقی کی ہے کہ حکومت نے برار کے شعبۂ تعلیمات کا ناظم ایک ہندو کو نامزد کیا ہے۔ ان کا نام راؤ صاحب نارائن ہے اور یہ پونہ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ اس تقرر پر انگریزی اخباروں نے بڑا واویلا مچایا ہے۔ اودھ اخبار نے ان کے اعتراضوں کو تردید کی غرض سے نقل کیا ہے۔[1] معترضوں کو شکایت ہے کہ جو فرنگی آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں انھیں ہندستان میں معمولی اسامیاں دی جاتی ہیں لیکن بڑی بڑی ملازمتوں پر ہندستانی مقرر کیے جاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ حکومت کی دانش مندی ہے کہ وہ اہلِ ملک کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے سے وابستہ کر رہی ہے۔ ان میں جو لوگ خاص طور پر ممتاز ہیں ان کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم کرشن چندر بنرجی کو لیجیے جو رُڑکی میں

[1] ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء

اوّل رہا اور انگریز طلبا سے بھی بازی لے گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے بنرجی کو مبارک باد دی۔

پچھلے مقالے میں علی گڑھ کالج کی فائیننس کمیٹی کے اس اہم اجلاس کا ذکر نہ کرسکا تھا جو سر ولیم میور کی موجودگی میں ۱۱ نومبر ۷۵ء کو منعقد ہوا۔ اب اس کی روداد اُردو زبان میں موصول ہوئی ہے اور میں اس کا تھوڑا سا حال سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس اجلاس میں کمیٹی کے ارکان کے علاوہ علاقے کے رؤسا اور کالج کے تمام بہی خواہ شریک تھے۔

سر ولیم سب سے پہلے سید احمد خاں کی رفاقت میں بنگلہ تشریف لے گئے جہاں کمیٹی کے صدر اور کالج کے سکریٹری مولوی سمیع اللہ خاں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ وہ بورڈنگ کے معائنے کے لیے گئے اور اساتذہ و طلبا سے بے تکلفانہ گفتگو کی۔ جلسے کی نشست کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ کمیٹی کے سکریٹری سید احمد خاں نے اُردو زبان میں اپنی رپوٹ پڑھ کر سنائی جس کے شروع میں معزز مہمان کی بجا طور پر تعریف تھی۔ بعد ازاں انھوں نے کمیٹی کی کارگزاری کی جو تفصیل سنائی اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ سب پر عیاں ہے۔ رپوٹ کے خاتمے پر سنّی و شیعہ دینیات کے دونوں پروفیسروں نے نثر و نظم میں قصیدے سنائے۔ آخر میں سر ولیم میور نے اُردو میں نہایت فصیح تقریر کی جو اخبار کے پانچ کالم میں چھپی ہے۔ ان کی اُردو دانی کا بڑا چرچا ہے۔

موصوف نے کہا کہ: "میرے دوست سید احمد خاں عرصے

یہ کالج قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کمیٹی کے ارکان نے اس کا ذکر کیا ہیں ان کی امداد کی وہ حد درجہ تحسین ہی۔ حکومت نے جب سے مجھے اس کالج کا مشیر نامزد کیا مجھے اس کے معائنے کی تمنا رہی۔ مغربی علوم کی تعلیم کا یہاں جو انتظام کیا گیا ہو اس صیغے سے مجھے خاص ہمدردی ہی اور اسی جذبے کے تحت میں نے اس ادارے کی مدد کی ہی سب مجھے یہ دیکھ کر عین مسرت ہوئی کہ یہ صیغہ حسن وخوبی سے اپنا فرض ادا کر رہا ہی۔" سر ولیم نے کالج کی رواداری کی تعریف کرتے ہوئے عیسائیوں کو مشورہ دیا کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ سر ولیم نے کہا کہ ہندستان جیسے ملکوں میں جہاں مذاہب کی کثرت ہو اور حکومتِ وقت کسی خاص مذہب کو ترجیح نہ دیتی ہو، تعلیم کا نظریہ دنیوی ہونا چاہیے۔ انھوں نے طلبا کو بھی مفید مشورہ دیا۔ کالج کے سرپرستوں اور کارپردازوں کی ستائش پر سر ولیم نے اپنا دلچسپ خطبہ ختم کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

یہ کہنا باقی رہ گیا کہ سر ولیم میور کے نام سے ایک وظیفہ دینے کے لیے کالج میں چندہ جمع کیا جا رہا ہی۔ اُدھر الہ آباد میں ان کا مجسمہ قائم کرنے کی تجویز ہی اور اس کے لیے ایک فنڈ کھولا گیا ہی۔ یہ تجویز مہاراجا بنارس کی ہی اور رقم کی فراہمی میں ہندو پیش پیش ہیں۔ اودھ اخبار نے چندہ دینے والوں کی فہرست چھاپتے ہوئے لکھا ہی[۱] کہ یہ سر ولیم سے زیادہ ہماری عزت کا باعث ہوگا۔ مہاراجا بنارس نے دو ہزار کا بیش بہا عطیہ عنایت فرمایا ہی۔

اس کے کچھ عرصے بعد مہاراجا پٹیالہ علی گڑھ کالج کو دیکھنے کے لیے آئے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ہال میں جا کر انھوں نے اس کی

[۱] ۲۱ جولائی اور یکم ستمبر ۱۸۷۶ء

مطبوعات کو ایک نظر دیکھا۔ بعد ازاں ان کا استقبال ٹاؤن ہال میں کیا گیا۔ مولوی سمیع اللہ کے ایڈریس کے بعد مولوی محمد اسحاق نے ایک نظم میں ان کا خیر مقدم کیا۔ مہاراجا نے ایک پُر لطف تقریر کی جس میں انھوں نے کالج کو اٹھارہ سو روپے کی سالانہ امداد مستقل طور پر دینے کا اعلان کیا۔ انھوں نے فوری طور پر اس کا انتظام بھی کر دیا اور ان کا اقرار نامہ ۱۰ دسمبر کے علی گڑھ اخبار میں شائع ہوا ہے۔ اپنے خطبے کے آخر میں انھوں نے کالج کے علاوہ ان سب ہندستانیوں کی بہبودی کی دُعا کی جو برطانیہ کے سایۂ عافیت میں رہتے ہیں۔ کالج کو جو عطیے ملے ہیں ان کی فہرست طویل ہے۔ مہاراجا وجیانگرم، نظام حیدرآباد اور سر سالار جنگ کے نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔

علی گڑھ اخبار نے وہ فرمان نقل کیا ہے جس کے مطابق حکومتِ ہند کالج کو دائمی طور پر بہت سی زمین دے دی ہے۔

اب اس کالج کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں۔ اس کے رُوحِ رواں سید احمد خاں ہیں اور اسے سارا وقت دینے کے لیے انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ اس وقت وہ جج کے عہدے پر بنارس میں تعینات تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی قوم کی ترقی کا انھیں کتنا دھیان ہے اور کس لگن سے وہ اس کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں کہ لوگ ان کے کام کی قدر کرتے ہیں یا نہیں۔ بہت سے تنگ نظر مسلمانوں کو ان کی آزاد خیالی سخت ناپسند

---

[1] علی گڑھ اخبار بابت ۱۰ جولائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجا پٹیالہ اور مہاراجا وجیانگرم کے عطا کیے ہوئے وظیفوں کی تقسیم کے لیے سید صاحب نے خاص انتظام کیا ہے۔

ہے۔ اس کے باوجود سارا ملک بہ یک زبان انھیں "ہندستان کا خیر خواہ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ استعفے کے موقع پر ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر نے ایک خط کے ذریعے ان کی خدمات کو بہت سراہا ہے۔ بنارس والوں کی طرف سے جن میں ہندو مسلمان اور انگریز سبھی شامل تھے۔ انھیں ایک رخصتی ایڈریس چاندی کی مزین صندوقچی میں رکھ کر دیا گیا۔

یکم اپریل کو مسٹر ٹرنر کی صدارت میں الہ آباد ہائی اسکول میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا۔ پرنسپل کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول میں اس وقت تقریباً چھ سو طالب علم ہیں۔ مسٹر ٹرنر نے اپنی تقریر میں کہا کہ "یہاں طلبا کی تربیت و تعلیم کا ایسا اچھا انتظام ہے کہ وہ صحت کے ساتھ انگریزی نظم سنا سکتے ہیں۔ ہندستان آکر میں خاص طور پر ایک چیز سے متاثر ہوا وہ یہ کہ یہاں کے طلبا کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انگریز بچوں کی طرح وہ کھیل کود میں زیادہ وقت نہیں گنواتے۔ اگر اس کے ساتھ ان میں جوش اور ولولہ بھی پیدا ہو جاتے تو وہ انگریزوں سے بڑھ جائیں۔ کیوں کہ صرف باتوں کو یاد رکھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان پر سمجھ بوجھ کر عمل کرنا اور بھی ضروری ہے۔ پیڑ لگانے سے حاصل ہی کیا اگر اس میں پھل پھول نہ آئیں[1]"۔

پچھلے مقالے میں میں نے اطلاع دی تھی کہ پروفیسر مونیر ولیمس اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ ہندستان گئے ہوئے ہیں۔ اس سفر کا مقصد انڈین انسٹی ٹیوٹ کی تجویز کو مقبول کرنا تھا۔ بمبئی پہنچ کر انھوں نے

[1] علی گڑھ اخبار ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء

اخبار ٹائمس آف انڈیا کو حسبِ ذیل خط لکھا: "آپ کا یہ قیاس بالکل صحیح ہی کہ مَیں معلومات حاصل کرنے آیا ہوں۔ کسی قسم کی تبلیغ سے مجھے دلچسپی نہیں۔ یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس کے امیدواروں کی تعلیم کے متعلق آج آپ نے جو اظہارِ خیال کیا ہی مَیں اس سے کلیۃً متفق ہوں۔

عام مقابلے کا طریقہ بہرصورت غنیمت ہی۔ لیکن انتخاب کے بعد امیدواروں کا لندن میں رہنا اتنا مفید نہ ہوگا جتنا آکسفورڈ میں دو سال رہایش اختیار کرنا۔ یہ مُراد نہیں کہ آکسفورڈ کا مجوزہ انڈین انسٹی ٹیوٹ صرف انھی کے لیے وقف ہوگا۔ سچی بات تو یہ ہی کہ انگلستان کے پڑھے لکھے لوگ بھی ہندستان کے معاملے میں جاہلِ مطلق ہیں۔ اب ولی عہد کے سفر کی وجہ سے ان میں اس ملک کے حالات جاننے کی خواہش زور پکڑ رہی ہی۔

مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ انگریزوں کی دلچسپی ہندستان کی طرف مائل کرے اور یہاں کے صحیح حالات انھیں بتلائے۔ اس کی یہ کوشش بھی ہوگی کہ تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو انگلستان جانے کا شوق دلائے۔ اگر ہندستانی طلبا اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے آکسفورڈ آنا پسند کریں تو انھیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جاسکتی ہی۔ مجھے امید ہی کہ ملک کے اکابر اس تجویز کو کامیاب بنانے میں میری مدد کریں گے اور اس کے سرپرستوں میں انگلستان کے سربرآوردہ اصحاب کی طرح ان کے نام بھی ہوں گے"۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخِ بمبئی کے ایک جلسے میں پروفیسر موصوف نے اپنی تجویز کو زیادہ صراحت سے بیان کیا۔ مجوزہ

انسٹی ٹیوٹ ایک قسم کی انجمن ہوگی جس میں مشرقیات سے دلچسپی لینے والے لوگ یک جا ہوسکیں گے۔ یہ تعلیمی ادارہ ہوگا جو متعلقہ مضامین میں آکسفورڈ کے نصابِ تعلیم کی تکمیل کرے گا۔ اسے ایسے پروفیسروں کا تعاون حاصل ہوگا جو سنسکرت، فارسی وغیرہ کے علاوہ قدیم ہندستان کے فلسفے اور آئین پر بھی درس دے سکیں۔ ہندستانی طالبِ علم کو ہر قسم کی آسانی بہم پہنچائی جائے گی اور ایسا انتظام کیا جائے گا کہ وہ یونانی اور لاطینی کی بجائے اپنی زبانیں سیکھ سکے۔"

پروفیسر ولیمس کے اعزاز میں ڈاکٹر آتما رام پانڈورنگ نے ایک پُرتکلف دعوت دی جس میں یورپیوں کے علاوہ کئی ہندو بھی شریک تھے۔ اس مجلس میں انگریز عالم کو ہندو دھرم کے متعلق تبادلۂ خیالات کا اچھا موقع ملا۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ Indian Wisdom کے نام سے انھوں نے اس مضمون پر ایک سیر حاصل کتاب لکھی ہے۔

اپنی تجویز کی تائید میں پروفیسر ولیمس نے ملک کے مختلف شہروں میں تقریریں کیں۔ کلکتہ کے جلسے میں بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے شرکت کی تھی۔ مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کا ایک مقصد تو یہ ہوگا کہ سول سروس کے امتحان کے لیے ہندستانی طلبا تیار کیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ یورپیوں کو ہندستان کے صحیح حالات سے اور ہندستانیوں کو یورپ کے حالات سے آگاہ کیا جائے۔ اگر انگریز ہندستان کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو ان کا طرزِ حکومت بھی بہتر ہو جائے۔ انھیں اس اجنبی ملک کے مذاہب، تمدن اور طور طریقوں کا غائر مطالعہ کرنا چاہیے اور یہی ایک صورت دونوں قوموں کے تعلقات کو مستحکم کرنے کی ہے۔

اگر پروفیسر ولیمس کی تجویز پر عمل ہوا تو آکسفورڈ میں ہندستانی طلبا کو صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ اپنی زبان کی بھی قدر معلوم ہوگی اور وہ ان ہندستانی صفات سے آشنا ہوں گے جنھیں وہ خود بھول چکے ہیں لیکن جن کی یورپ کے علمی حلقوں میں عزت ہے۔

کلکتہ کے جلسے میں بابو کیشو چندر سین نے بھی شرکت کی اور اس تجویز کی تائید کی۔ سرٹمپل نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کو تین درجوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ ایک تو ہندستانی طلبا کے لیے مخصوص ہو اور دوسرا ان انگریزوں کے لیے جو ہندستان جانے والے ہوں۔ تیسرا ان لوگوں کے لیے جو ہندستان سے دل چسپی رکھتے اور وہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتے ہوں۔

لندن ٹائمس میں پروفیسر مونیر ولیمس کا جو خط شایع ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادۂ ویلز اور وائس رائے ہند نے ان کے انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی قبول کرلی ہے۔

کلکتہ سے آگرہ اور دلی ہوتے ہوتے پروفیسر ولیمس لاہور گئے۔ وہاں ان کے اعزاز میں انجمن پنجاب کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں بھی انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد بیان کیے اور انجمن سے امداد کی درخواست کی۔

اس جلسے میں مشہور ماہر مشرقیات مسٹر ایسٹ وک Eastwick بھی موجود تھے۔ انھوں نے ہندستان کے متعلق بڑی چھان بین کی ہے اور بہت بڑے پیمانے پر اس ملک کا 'گائڈ' تیار کر رہے ہیں۔ سارا ملک آٹھ حلقوں میں بانٹا جائے گا اور ہر ایک کے لیے ایک جلد وقف

ہوگی۔ علاوہ براں بڑی محنت سے انھوں نے کئی نادر قلمی کتابوں کو
مٹنے سے بچا لیا۔ لاہور کے شاہی علاقے میں کتبوں کا معائنہ کرتے
ہوئے وہ ایک گاڑی کے نیچے آ گئے تھے۔ بال بال بچ گئے ورنہ
جان جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی[1]

انجمن پنجاب کے مذکورۂ بالا جلسے کا ذکر کرتے ہوئے اودھ
اخبار نے یہ مضمون سپردِ قلم کیا ہے[2]: "معزز مہمان نے اس مجلس میں جو
تقریر کی وہ بتا رہی تھی کہ انھیں ہم سے بڑی ہمدردی ہے اور
ہمارے معاملات سے ان کی دلچسپی مخلصانہ ہے۔ انھوں نے
ہماری اس شکایت کا ذکر کیا کہ انگریز حاکم ہمارے مزاج اور
رسم رواج کو بالکل نہیں سمجھتے اور کہا کہ یہ شکایت بڑی حد تک
صحیح ہے۔ لیکن جس طرح انگریز ہندستانیوں کو نہیں سمجھتے اس دیس
والے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ضرورت اس
کی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تہذیب اور تمدن کو سمجھنے کی
کوشش کریں۔ جب تک ایسا نہ ہوگا دونوں کا اتحاد نامکمل رہے گا۔

لارڈ میو کے زمانے میں اہلِ ملک کے لیے کئی اسامیاں
مخصوص کر دی گئی تھیں۔ پروفیسر ولیمس کا ارادہ ہے کہ ان کے امیدوار
آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجے جائیں۔ یونی ورسٹی ایسا انتظام کرنے کا ذمہ
لیتی ہے کہ نامانوس اور اجنبی چیزوں کو دیکھ کر ان طلبا کے فطری رجحان
میں کوئی فتور نہ ہو اور ان کی تربیت میں کوئی نقص نہ پیدا ہو۔
اس کے لیے ان کی تعلیم کا خاص انتظام کرنا ہوگا اور

[1] Indian Mail ۱۳ مارچ ۱۸۷۶ء [2] ۲۳ فروری ۱۸۷۶ء

اس کے بعد دونوں قوموں کے باہمی تعلقات استوار ہو جائیں گے ان میں حاکم اور محکوم کی تمیز نہ ہوگی اور اس بنا پر کسی شکایت کا موقع نہ ہوگا۔

مسٹر ایسٹ وک نے پروفیسر ولیمس کی تجویز کو بہت سراہا اور ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے وہ ان دونوں کی تقریروں کا خلاصہ ہے۔ ہم ہندستانیوں کا فرض ہے کہ ان خیر خواہ عالموں کی تجویز کو قابل عمل بنائیں ..... کیا اب بھی ہم اپنی روایتی بے پروائی کو نہ چھوڑیں گے؟ ان انگریزوں نے جو راستہ سمجھایا ہے اس پر چلنے میں ہمارا سراسر فائدہ ہے۔ ہمیں فوراً چندہ جمع کرنے کے لیے کمیٹی بنانی چاہیے اور ایسی کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے نوجوان یورپ جاکر وہاں کے علوم و فنون سے بہرہ مند ہوں۔

یہ اچھی بات ہے کہ اس تجویز میں کسی خاص فرقے یا مذہب کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا اس کار نیک میں بلا تکلف ہم ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔"

ہندستان سے واپسی کے بعد پروفیسر ولیمس نے ایک مضمون لکھا جس میں بتایا ہے کہ ان کا سفر بہت کام یاب رہا اور ان کی رائے انگریزوں اور ہندستانیوں میں یک ساں مقبول ہوئی۔ ان کی اپیل پر پانسو ملکی لیڈروں نے دستخط کیے۔ ان کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ یونانی یا لاطینی کی بجائے ہندستانی طلبا کو ان کی کلاسک زبانیں پڑھائی جائیں اور انھیں امتحان میں لیا جائے۔

آکسفورڈ یونی ورسٹی نے انڈین سول سروس کے امیدواروں کو خاص مراعات دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی تائید میں پروفیسر

[redacted]

ولیمس نے کہا کہ یہ مراعات ان سب کو ملنی چاہییں جو ہندیات کا خاص مضمون کی طرح پڑھنا چاہتے ہیں۔

اس دوران میں لندن کے Ambleswangar's Home (ایشیائی مسافروں کا مسکن) کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ کئی ہندستانی اخباروں کی رائے ہے کہ اسے آکسفورڈ منتقل کر دینا چاہیے۔ ایشیا اور افریقہ کے بہی خواہوں نے کئی سال سے یہ ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی ہوتی کہ اس میں پادری کے فرائض جارج اسمال کے سپرد ہیں۔ موصوف دس سال تک کلکتہ اور بنارس میں رہ چکے ہیں اور سنسکرت، بنگالی و ہندستانی سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ ان کی دو کتابیں 'سنسکرت ادب کا مقدمہ' اور 'توتا کہانی' کا ترجمہ مشہور ہیں۔

اکتوبر میں پروفیسر ولیمس دوبارہ ہندستان روانہ ہوتے پہلی مرتبہ وہ صوبۂ مدراس نہ جا سکے تھے۔ اب کے وہ وہاں اپنی تجویز کی اشاعت کے علاوہ قلمی نسخوں کی تلاش کریں گے جن کی ضرورت انھیں اس عظیم الشان کتاب کے سلسلے میں ہے جو ہندو مذہب اور اس کے فرقوں پر وہ لکھ رہے ہیں۔

پنجاب کے اخباروں نے ڈاکٹر لائٹنر کی واپسی پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ انھیں اس ملک سے جتنی محبت ہے ملک والوں کو بھی ان کی ذات سے اتنی ہی محبت ہے۔ وہ کالج کے پرنسپل اور انجمن لاہور کے صدر ہیں۔ اس موقع پر شعبۂ عربی کے پروفیسر مولوی عبدالحکیم نے ایک نہایت عمدہ قصیدہ لکھا ہے جسے پنجابی اخبار نے چھاپا ہے۔ اُ ۔ ی کی طرف سے ان کی خدمت میں خیر مقدم

۸ اپریل ۱۸۷۰ء

کا ایڈریس پیش کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کا ذکر آیا تو مجھے یاد پڑا کہ اس نے رائے بہادر پنڈت موتی لال کو اُردو کا اور بابو چندر لال کو ہندی کا ممتحن مقرر کیا ہے۔[1]

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی شاخ لندن کی سالانہ رپوٹ بابت ۱۸۷۶ء میری نظر سے گزری۔ اس انجمن کا مقصد ہندستان کی سماجی اصلاح ہے۔ یہ معلوم کرکے مجھے خوشی ہوئی کہ اس وقت انگلستان میں اسّی طالبِ علم ہیں جو یا تو سول سروس کی تیاری کر رہے ہیں اور یا قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو تفریح یا سیر کی غرض سے آتے ہوتے ہیں۔ یہ سوسائٹی ان ہندستانیوں کے سفر کو خوش گوار بنانا چاہتی ہے جو سات سمندر پار ولایت آتے نہیں گھبراتے۔ انھیں ایسے لوگوں سے متعارف کرتی ہے جو ان کے کام آ سکتے ہیں اور انھیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ سوسائٹی ایسے جلسے منعقد کرتی ہے جن میں ہندستانی ان انگریزوں سے ملتے ہیں جو ان کے دیس سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ رپوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایسوسی ایشن کا رسالہ ہندستان میں از حد مقبول ہے۔ نیز اس کی شاخیں مدراس، بمبئی اور دیگر مقامات میں قائم ہو چکی ہیں۔

کلکتہ میں بھی ہندستانیوں اور انگریزوں میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کے مشترکہ جلسوں کے لیے ایک عمارت بنانے کی تجویز زیرِ غور ہے۔ وہاں اخبار بینی کے علاوہ

[1] Indian Mail ، ۴ مئی ۱۸۷۶ء

ادبی و علمی مباحثوں کا بھی انتظام ہوگا۔ مہاراجا ہلکر نے اس عمارت کے لیے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا ہے[51]

میں یہ اطلاع دے چکا ہوں کہ نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی بانی مس کارپنٹر ہندستان گئی ہوئی تھیں کراچی میں ان کا شان دار استقبال کیا گیا اور انھوں نے ایک اسکول کے فنڈ میں پانسو روپے دیے۔ پونہ کے ایک جلسے میں انھوں نے مختلف معاشی مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ مدراس ہوتے ہوئے وہ کلکتہ گئیں اور وہاں برہمو سماج کے ایک مذہبی جلسے میں شرکت کی۔ سال رواں سنہ ماہ اپریل میں وہ جب یورپ روانہ ہوئیں تو ان کے ساتھ بابو ششی پرشاد بنرجی کے دو بچے تھے جن کی تعلیم انگلستان میں ہوگی[52]۔ لندن پہنچ کر انھوں نے اپنے سفر پر ایک نہایت دل چسپ تقریر کی۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے اس ایڈریس پر دستخط کیے جو سر سالار جنگ کو دیا گیا ہے۔

سید احمد خاں کی پیروی میں مولوی سید امداد علی آگرہ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک مدرستہ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کاش ایسے بہت سے اسکول بن جائیں اور مسلمان طالبات مغربی تعلیم حاصل کر سکیں۔ سید احمد خاں نے بہت عرصہ پہلے 'تہذیب الاخلاق' میں لکھا تھا کہ قومی ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم از بس ضروری ہے اور اس کا بندوبست جتنی جلدی ہو سکے

۵۱؎ علی گڑھ اخبار ۵ نومبر ۷۵ء

۵۲؎ Indian Mail ۱۷ جنوری ۷۶ء

آتنا ہی اچھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد یہ اور بھی ضروری ہوجاتا ہو کہ عورتوں کے لیے انھی اصولوں پر ایک تعلیم گاہ بنائی جائے۔ کیوں کہ کوئی پڑھا لکھا لڑکا کسی جاہل عورت سے شادی کیوں کرنے لگا ہو" بمبئی کے زنانہ الیگزینڈرا اسکول کے معائنے کے لیے پچھلے سال راجا کولھاپور، مہاراجا بھاؤنگر اور نواب رادھن پور کے علاوہ سدرلینڈ کے ڈیوک بھی آئے تھے۔ ان سب نے بریک زبان اسکول کی پرنسپل کے عمدہ انتظام کی تعریف کی اور اسکول کے بانی مانک جی کرسٹ جی کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہو۔

معلوم ہوتا ہو کہ پنجاب کے شرفا خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لیے بڑے شوق سے اسکول بھیج دیتے ہیں۔ ملک کے دوسرے صوبوں میں یہ بات نہیں۔ لاہور اور اطراف کے اسکولوں میں مسلمان طلبا کی اکثریت ہو۔ ہوشیارپور اور گرداس پور کے آدھے سے زیادہ طلبا دُور دُور سے آتے ہیں۔ لاہور میں تو یہ دیکھا گیا ہو کہ دیہاتی لڑکے اپنے گاؤں چھوڑ کر تعلیم کے شوق میں شہر آجاتے ہیں[1]۔

صوبۂ سرحد کے ضلع ہزارہ کی تعلیمی ترقی دل چسپی سے خالی نہیں۔ چار سال پہلے یہاں صرف تین اسکول تھے اور ان میں بھی گنے چنے

---

[1] اودھ اخبار ۵ مارچ ۷۶ء یہ لکھنا بھول گیا تھا کہ مذہب پرست پارسیوں کو سخت شکایت ہو کہ ان کے بچوں کو خالص دنیوی تعلیم دی جاتی ہو جس کی وجہ سے وہ بڑے ہو کر پرانی باتوں کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

لڑکے آتے تھے۔ اب اسکولوں کی تعداد ۲۵ ہے جن میں کوئی چھ سو طلبا ہیں۔ ان میں سے کئی آزاد علاقے سے پڑھنے آتے ہیں[1]

صوبہ جات شمالی و مغربی کی تعلیمی ترقی بھی اطمینان بخش ہے۔ اس سلسلے میں لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ ابتدائی تعلیم یا تو مفت اور یا بہت ارزاں ہے۔ لیکن اعلا تعلیم کے اخراجات تدریجی طور پر بڑھتے جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے شائق صرف امیرزادے ہیں جنھیں سرکاری بڑی اسامیوں کی خواہش ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی امیروں اور غریبوں میں تفریق کرنی چاہیے تاکہ سب کو تعلیم سے فیض یاب ہونے کا یک ساں موقع ملے۔ مدرسوں کی تنخواہ مقرر ہونی چاہیے یہ نہیں کہ جتنی فیس ملے ان میں بانٹ دی جائے[2]

شاہ آباد (بہار) میں ایک اسلامیہ مدرسہ ہے جس میں تقریباً چالیس طلبا دینیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کی طرح اب بھی نادار طلبا کے خورد و نوش کا مفت انتظام کیا جاتا ہے۔ بندیل کھنڈ کے راج کمار کالج میں کوئی بتّیس طلبا ہیں جن میں کئی ریاستوں کے ولی عہد بھی ہیں۔ صوبۂ مدراس کے زمیں داروں اور راجاؤں کی اولاد کے لیے بھی اسی قسم کی تعلیم گاہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ لیکن اس کے لیے کم از کم دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے تجویز پر عمل ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ متوسط ہند کے راج کماروں کے لیے اسی " کا کالج اندور میں بنانے کا سوال

ـه Indian Mail یکم اپریل ۶۶ء

ـه علی گڑھ اخبار ۵ اگست ۶۶ء

بھی زیرِ غور ہے۔ یوں تو وہاں ایک بہت بڑا کالج پہلے سے ہے جس میں امرا کے لڑکے لیے جاتے ہیں۔ ایک خاص درجے میں ہلکر کے ولی عہد رتلام کے راجا، نواب زادہ باندہ اور دیگر رئیس زادے تعلیم پاتے ہیں۔

اجمیر کے میو کالج میں حسبِ دستور راج کماروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ فی الحال ان کی تعداد ۲۳ ہے اور اس میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اودھ کے ناظمِ تعلیمات مسٹر نیس فیلڈ کی رپورٹ کے مطابق اس صوبے میں ۱۵۵۵ اسکول ہیں جن میں ساٹھ ہزار طلبا ہیں یعنی دو سو باشندوں پر ایک طالبِ علم کا اوسط بیٹھتا ہے۔ ہندی کے مقابلے میں اُردو کا زیادہ چلن ہے۔ گوکہ ہندی کو بے جا طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تاہم ۷۴-۱۸۷۳ء میں اُردو خوانوں کی تعداد ۳۱۸۸۹ سے بڑھ کر ۳۳۳۸۸ ہو گئی اور ہندی خوانوں کی تعداد ۲۶۴۲۸ سے گھٹ کر ۲۴۱۱۳ رہ گئی۔ انگریزی خواں ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھے اور عربی پڑھنے والے آٹھ سو تھے۔ لیکن سنسکرت کے شیدائی دو سو سے زیادہ نہ نکلے۔ کُل خرچ کا ۷ ½ فی صدی فیس سے وصول ہوا۔ باقی کی کفالت حکومت نے کی۔[1] یہی رپورٹ شاہد ہے کہ اودھ میں — جہاں کی واحد زبان ہندستانی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کی بہ نسبت سرکاری تعلیم کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت اسکولوں میں ملے گا۔

کلکتے کے بڑے پادری ڈاکٹر Middleton مڈل ٹن کا قائم کردہ بشپ کالج ہگلی کے کنارے بنا ہوا ہے۔ اس میں ہندستانی

۱؎ علی گڑھ اخبار، ۱۷ دسمبر ۱۸۷۵ء

[illegible]

تنگ آکر وہ خودکشی کرلیتی ہیں اور اس پرستی کو بہرحال ترجیح دیتی ہیں کیوں کہ اسے وہ مذہباً مستحسن سمجھتی ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہندستان کی تمام اصلاح پرور انجمنیں بیواؤں کی شادی کی مؤید ہیں[1]۔ ہندو بیوہ کی بے بسی کی مثال حسبِ ذیل واقعے سے ملے گی جو میں اودھ اخبار[2] سے نقل کرتا ہوں: "کلکتہ میں ایک تشکیل اور تعلیم یافتہ ہندو لڑکی شری متی کماری داسی نامی رہتی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہوگئی۔ انتہائے غم میں اس نے خودکشی کے ارادے سے افیون کھالی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تو گھر والوں کو اس کی ایک تحریر ملی جس میں بتلایا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان کیوں لے رہی ہے۔ یہ تحریر اخباروں میں شایع ہو چکی ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "اب میں جی کر کیا کروں! دوبارہ شادی بے وفائی ہوگی۔ بچپن کی شادی سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔ میں زہر کھا رہی ہوں کیوں کہ چین مجھ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا۔ ہندو عورت سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا۔ میرا بیاہ ۱۴ سال کی بالی عمر میں ہوگیا اور چار سال میں میں بیوہ بھی ہوگئی۔ اس بارِ غم کو برداشت کرنے کی ضرورت میں محسوس نہیں کرتی۔ بھگوان نے مجھے عورت کیوں بنایا؟"

اس المناک سانحے پر اودھ اخبار یوں نعرہ زنی کرتا ہے:

---

[1] عبدالکریم خاں نے اس موضوع پر 'رانڈوں کی شادی' کے عنوان سے ایک مفید رسالہ لکھا ہے۔

[2] ۲۱ نومبر ۵ء

"اصلاح پرور جماعتیں اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتیں؟ یہ سچ ہے کہ ایک دم وہ اس کبیدہ رسم کو روک نہیں سکتیں۔ لیکن بیواؤں کی حالت میں تو اصلاح ہو سکتی ہے۔ تمام مذاہب کی ایک مشترکہ کانفرنس میں اس مسئلے پر غور ہونا چاہیے اور بیواؤں کی شادی کو معمول کرنا چاہیے۔ کم سے کم پڑھے لکھوں کو تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ کوئی مذہب اس کی ممانعت نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہندستان میں ہر چند سرمایے کوئی ان بدنصیب عورتوں پر رحم نہیں کھاتا۔ زمانۂ قدیم میں مسلمانوں میں بیوہ کی شادی کا چلن تھا۔ عالم اسے سراہتے تھے بلکہ اسے کسر نفس کی علامت تصور کرتے تھے۔ جب ہندوؤں میں بھی اس کی اجازت ہے تو وہ اس معاملے میں مسلمانوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔

جب حدیثوں میں بیواؤں کی شادی کی تلقین کی گئی ہے تو آج کل کے مسلمان اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اسے برا کیوں سمجھتے ہیں؟ عالم اور قاضی عام مسلمانوں کو اس بات پر رضامند کیوں نہیں کرتے کہ جوان بیواؤں کی شادی کو اپنا فرضِ منصبی سمجھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد کٹ ملا اس قسم کے مستحسن اقدام کے خلاف کچھ نہ کہیں گے بلکہ اس کی حمایت میں پیش پیش ہوں گے۔

ہندستانی مسلمانوں میں اس تجویز کی مخالفت دو طبقوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایک تو وہ نیم ملا جن سے خدا ہماری قوم کو محفوظ رکھے۔ دوسرے خود عورتیں جن کی کم عقلی مسلم الثبوت ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے محبت ہی۔ لیکن باقی تینوں کا کیا حشر ہوگا؟[۱] کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دوسری شادی کرلیں؟ اگر یہ ہوسکا تو اصلاح پرور جماعت کو اپنے اصولوں کی اشاعت کا اچھا موقع ملے گا۔

منشی پیارے لال اس کمیٹی کے صدر ہیں جس کا مقصد شادی بیاہ کی فضول خرچی کو روکنا ہی۔ انھیں اس مقصد سے بڑی دلچسپی ہی۔ اپنے صوبۂ بہار کا دورہ کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکام کے تعاون سے انھوں نے دیہاتیوں کے لیے اخراجات کی فہرست بنادی ہی۔ کوئی اسے نہ مانے تو حاکم ضلع سے شکایت کی جاسکتی ہی۔[۲]

گزشتہ ۳۰ جولائی کو پونہ میں صغرسنی کی شادی کی روک تھام کے لیے ایک کانفرنس ہوئی۔ رائے بہادر گووندرام نے ایک پرجوش تقریر کی جس میں اس برے رواج کی سخت مذمت کی گئی۔ اس کے نقصانات کی تفصیل سنانے کے بعد فاضل مقرر نے بتایا کہ یہ شاستروں کے احکام کے خلاف ہی۔ لیکن ایک طرف تو نیک لوگ یہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسری طرف رجعت پسند جاہلوں نے جو گجراتی ہندوؤں کی ایک ذات کے لیڈر ہیں یہ منادی کردی ہی کہ جو اپنی بیٹی کا بیاہ چھ مہینے کی عمر میں نہ کرے گا وہ ذات باہر کردیا جائے گا![۳]

پنجابی نے اطلاع دی ہی کہ ضلع لاہور کے قصبۂ قصور میں ایک انجمن قائم کی گئی ہی۔" حالاں کہ اس کی عمر بہت کم ہی اور اس کے

[۲] اودھ اخبار ۲۱ اپریل ۱۸۷۶ء

[۳] علی گڑھ اخبار ۲۲ ستمبر ۱۸۷۶ء

کامیابی کی تعداد بہی گنی چنی ہی تاہم ان کی کام یابی قابلِ ستائش ہی۔ اس وقت انجمن کے ارکان کی تعداد ۲۲۸ ہی۔ ہمیں امید ہو کہ جو لوگ صنعت وحرفت کے حامی ہیں ہر طرح انجمن کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ اس کے ماہانہ رسالے کے خریداروں کی تعداد ۳۲۵ ہی۔ اس کی ترتیب میں اچھے اچھے لکھنے والے حصہ لیتے ہیں اور پچھلے سال سب ملاکر اس میں ۶۵ مضامین نظم ونثر درج ہوے۔

صنعت وحرفت کے طلبا کی تعداد ۱۲۵ ہی۔ انجمن کے اینگلو اُردو اسکول میں ۳۳۴ طالبِ علم ہیں۔ انجمن کے کتب خانے میں مختلف زبانوں کی ۲۴۷ کتابیں ہیں جن میں سے کچھ تو لوگوں کی دی ہوئی ہیں اور کچھ خریدی ہوئی ہیں۔ ایسے چھوٹے سے شہر میں اتنی کارآمد انجمن کی موجودگی بڑی تعریف کی بات ہی۔

انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہو کہ اس نے زراعت کی طرف توجہ کی ہی۔ زراعت صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ملک بھر کا سب سے اہم پیشہ ہی۔

ضلع کانگڑہ کے شہر نورپور میں 'انجمن خیر خواہِ ملک' ظہور میں آئی ہی۔ اس کے صدر پنڈت درگا پرشاد ہیں اور تقریباً پچاس ارکان میں سے کچھ سرکاری عہدے دار ہیں اور باقی شرفائے شہر ہیں۔ مہینے میں دوبار اس کے جلسے ہوتے ہیں اور انجمن کے ماہ نامے میں ان کی روداد چھپا کرتی ہی۔ انجمن کی کارگزاری ادب اور تعلیم تک محدود ہی۔ کالج اور اسکولوں کے نادار طلبا کو مفت درسی کتابیں بانٹنے کی غرض سے انجمن چندہ بھی وصول کرتی ہی۔ وہ ایک کتب خانہ

قائم کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔

ضلع مظفر پور کے قصبۂ حاجی پور میں کچھ عرصے سے انجمن رفاہِ عام قائم ہوئی ہے۔ اس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس کی دلچسپی کا مرکز بھی ادب اور علم ہے۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ اپنے ارکان کے لیے ملک کے تمام اہم اخبار منگواتے۔ اس کے کارکنوں میں ایک نامی گرامی شاعر اللہ یار ہے جس کی غزلیں اخبار پنجابی میں چھپا کرتی ہیں۔

نواب گنج ضلع بارہ بنکی کے رئیس نے اپنے قصبے میں انجمن تہذیب قائم کی ہے۔ اس کا افتتاح مسٹر Wood وُوڈ نے کیا اور اُردو میں اپنی فصیح تقریر کی جس کا خلاصہ اودھ اخبار[1] میں شائع ہوا ہے اس کے سکریٹری میر واجد علی اور پنڈت رتن ناتھ ہیں۔ ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ انجمن ہے۔

سوہاگ پور ضلع ہوشنگ آباد میں انجمن فلاح اہلِ اسلام کے نام سے ایک بھاری بھرکم کمیٹی بنی ہے۔ فرسودہ رسموں کے انسداد کے علاوہ مسلمانوں کی تعلیم اور روزی کا انتظام اس کے مقصدوں میں شامل ہے۔ غریب مسلمانوں کی دست گیری کی طرف بھی یہ انجمن توجہ کرتی ہے۔

اس سال کے شروع میں برہمو سماج کی نگرانی میں بابو نوین چندر رائے نے الہ آباد میں یتیموں اور بیواؤں کے لیے ایک محتاج خانہ کھولا ہے۔ یہ کسی قوم یا ذات کے لیے محدود نہیں، اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ امیدواروں

---

[1] ۱۹ جولائی سنہ ۶۹ء

کو محتاج خانے کے قواعد کی پابندی کرنی ہوگی اور ان کے طریقۂ تعلیم پر چلنا ہوگا۔

گزشتہ ۲۷ اپریل کو بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے کلکتہ میں ایک ہال کا افتتاح کیا جو شاہزادۂ ویلز کے سفر کی یادگار میں قائم کیا گیا ہی۔ لوگ بہت عرصے سے ایک ایسی جگہ کی کمی محسوس کر رہے تھے جہاں وہ جلسے کر سکیں اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مل سکیں۔ بابو کیشوچندرسین نے اس موقع پر ایک دل چسپ تقریر کی۔

(۶)

مذہب اور زبان وادب میں چولی دامن کا ساتھ ہی۔ اس وجہ سے ہندستان کے دو سب سے بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کا ذکر ناگزیر ہی۔ ہندومت میں بھی سب سے پہلے برہموسماج کا ذکر کرنا ہی جس نے ہندوؤں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہی۔ یا یوں کہیے کہ انھیں مغربیت کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کیا ہی۔

اس سماج کا سالانہ جلسہ گزشتہ ۲۲ جنوری کو کلکتہ میں ہوا۔ مہانوں میں بنگال کے لفٹنٹ گورنر اور کلکتہ کے لاٹ پادری ممتاز تھے۔ جلسہ ایک دعا اور ایک بھجن کے ساتھ شروع ہوا۔ پھر بابو کیشوچندرسین نے اپنا خطبہ سنایا اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ عیسیٰؑ نے اپنی ملت کی قیادت کلیسا کے سپرد کی تھی تاکہ ان کے پیرو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہ پائیں۔ ہر عیسائی فرقے نے کلیسا کی عظمت کو تسلیم کیا ہی اور عیسیٰؑ کے خلیفہ سینٹ پال نے اس کے استحکام کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ آگے چل کر بابو صاحب

نے کہا کہ برہمو سماج حقانیت کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اصول ویدوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ ان کی رائے میں الوہیت کی جیسی وضاحت ویدوں میں کی گئی ہے کسی آسمانی کتاب میں نہ ملے گی۔[1]

اخبار (Indian Mirror) انڈین مرر کا بیان ہے کہ برہمو سماج نے ایک پھلواری خریدلی ہے جس میں بابو کیشو چندر سین اپنے رفیقوں کے ساتھ جمع ہوتے اور ایشور کے بھجن گاتے ہیں۔ پیڑوں کی چھانو میں مرگ چھالا بچھا کر یہ لوگ گھنٹوں روحانیت کے مسئلوں پر غور کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ تو خدا کی یاد میں محو ہو جاتے ہیں اور کچھ باغ بانی کرنے لگتے ہیں۔ کوئی پانی لا رہا ہے، کوئی پیڑ کاٹ رہا ہے، کوئی قلم لگا رہا ہے۔ استغراق کا وہ عالم ہوتا ہے کہ لوگوں کو تن بدن کی سُدھ نہیں رہتی۔ تھک کر سب گھڑی بھر کے لیے سو جاتے ہیں اور جاگ کر دوبارہ یادِ الٰہی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ شام کو یہ لوگ آرتی کی گھنٹی بجا کر کیرتن گانے لگتے ہیں اور بسا اوقات مست ہو کر سڑکوں پر نکل پڑتے ہیں۔ کسی غریب کا جھونپڑا آیا تو اس میں جا کر حمد گانے لگتے ہیں۔[2]

سنا ہے کہ ایک نوجوان برہمو سماجی جو جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے خشکی کے راستے پیدل ہندستان لوٹنا چاہتا ہے تاکہ یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں کے طور طریقوں کا بہ ذاتِ خود مطالعہ کرے اور اپنے دیس والوں کو ان کے حالات سنائے۔

---

[1] Indian Mail ۲۸ فروری ۶۶ء

[2] پنجابی، جون ۶۶ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [redacted] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کی طرح سوامی دیانند بھی بُت پرستی کے مخالف ہیں اور ویدوں کے
پُرانے مذہب کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

مَیں نے اپنے پچھلے مقالے میں لکھا تھا کہ بابو کیشو چندر سین
اپنے ساتھیوں کو یورپین لباس پہننے سے منع کرتے ہیں کیوں کہ ان
کی بارے میں یہ وطن سے بُعد پیدا کر دیتا ہی۔ پنجابی[1] نے ایک طویل
مضمون میں ان لوگوں کی مذمت کی ہی جو پرایا لباس پہنتے ہیں۔
اسی موضوع پر علی گڑھ اخبار میں بابو کاشی ناتھ نے لکھا ہی کہ: "ہر
قوم کا اپنا ایک لباس ہوتا ہی۔ لیکن ہندستان میں ہندو اپنی دھوتی
پر قائم ہیں تو بہت سے لوگ تُرکی ٹوپی اور یورپین پتلون کے
شیدائی ہیں۔ اس قسم کی افراتفری ہمیں زیب نہیں دیتی.... قومیت
کے طرف داروں کو اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ کم از کم عورتوں
کو تو انگریزی گھاگھرے اور سایہ سے بچنا چاہیے۔ ہمیں تو وہ
ساری اور چادر ہی بہت بھلی لگتی ہیں۔
یہ بھی مناسب نہیں کہ یونی ورسٹی میں تقسیمِ اسناد کے موقع پر
قبا اور جبّہ پہنی جائے۔ کیا ان تقریبوں میں قومی لباس پہننا نامناسب
ہی؟ منصفوں اور سرکاری افسروں کی یہ ضد کہ ان کے آگے لوگ
مخصوص لباس میں پیش ہوں، یقیناً قابلِ ملامت ہی۔ وکیلِ ہندستان
کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہی کہ حکومت اس ضمن میں کوئی قاعدہ بنادے
تاکہ لوگ افسروں کے غمزوں کے شکار نہ ہوں"۔

اب ان ہندوؤں کی طرف آیئے جو اصلاح کے مخالف ہیں۔

[1] ۱۹ اگست ۱۸۷۶ء

دھرم سبھا نے گزشتہ ۱۶ جنوری کو قیصر باغ لکھنؤ میں اپنی پہلی سال گرہ منائی۔ اودھ اخبار کا نامہ نگار لکھتا ہے:[1] "صبح سے شام تک غریبوں میں اُبلے ہوئے چاول بٹتے رہے۔ ہزاروں اس سدابرت سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد سبھا کے کارکنوں کا جماؤ گھٹ گیا۔ ان میں پنڈت اور گیانی زیادہ تھے۔ تین سو سے کم نہ ہوں گے۔ پہلے تو شیو گیتا اور راماین کا دور ہوا جسے حاضرین نے کان لگا کر سنا۔ پھر مہاراج پنڈت گنگا دھر نے دھرم سبھا کے مقصد پر روشنی ڈالی۔ آخر میں مقدس وید کی کوئی دعا بہ بانگِ دُہل پڑھی جس کا مطلب یہ تھا کہ: "جب تک سورج اور چاند قائم ہیں یہ سبھا زندہ رہے اور اسے دن دُونی رات چوگنی ترقی ہو......" اب گانے بجانے والوں نے اپنے کرتب دکھائے اور خوب رنگ جمایا۔ رات تک یہ نشست رہی۔ بعد ازاں پنڈتوں کو چاندی اور دوسروں کو مٹھائی ملی"۔

انڈین ڈیلی نیوز، نامی انگریزی اخبار نے قدامت پسند ہندوؤں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے پُرانے رسم و رواج کی حفاظت کے لیے منظم ہو جائیں۔ "مغربی تہذیب کے سیلاب میں سب کچھ بہا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ہم میں کئی بُرائیاں ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہیں اور انھیں بہر حال زندہ رہنا چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے دھرم اور ہماری تہذیب میں اتنی یگانگت ہے کہ اصلاح کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ کام کرنے کا ہے اور جنھیں اپنی قدیم روایت سے محبت ہے انھیں دھرم سبھا کی ہر امکانی مدد

[1] اودھ اخبار ۲۶ جنوری ۱۸۶۶ء

کرنا چاہیے۔"

اس چند وجوہ کے باوجود ہندستان کے پرانے رسم و رواج رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں۔ کئی فرسودہ تیوہار سرکاری طور پر بند کر دیے گئے ہیں۔ اس سال ہندو بیوپاریوں نے دسہرا نہ منانے کا فیصلہ کیا ہے[1] تاہم عوام اپنی پرانی ڈگر پر چلے جاتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہندو مسلمانوں میں میل جول نہیں ہے۔ شہنشاہ اکبر کی پیروی میں مسلمان اب بھی ہندوؤں کی تقریبوں میں خوشی خوشی حصہ لیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ہم نے اس اتحاد کی مثالیں بھی دی ہیں۔

دہلی کی انجمن اسلامیہ کا ایک جلسہ گزشتہ ۲۲ مئی کو ہوا تھا۔ اخبار پنجابی نے اس کا تھوڑا سا حال لکھا ہے:[2] "انجمن کے اکثر ممتاز ارکان نے جلسے میں شرکت کی۔ آغا حسن خاں بہادر بھی تھے جنھیں ان کی خدمات کے عوض حکومتِ انگلشیہ نے ہزار روپے سالانہ کی پنشن دی ہے۔ شاہزادۂ ویلز نے انھیں انگلستان آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ انجمن کے ناظم خواجہ علی احمد نے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے بعد انجمن کی کارگزاری بیان کی۔ منشی محمود الحسن نے ملکہ کو شہنشاہ کا خطاب دیے جانے کی اہمیت بتائی اور برطانیہ کے وزیر اعظم نے اس ضمن میں پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا تھا، اس کا خلاصہ سنایا۔ منشی جی نے یقین دلایا کہ ہندستان کے رئیس

[1] اودھ اخبار ۳۰ اگست ۷۶ء

[2] ۱۰ جون ۷۶ء

اس خطاب پر خفا نہ ہوں گے بلکہ بہت مسرور ہوں گے مناسب تو یہ ہی کہ رعایا کی طرف سے ملکہ کو مبارک باد کا پیغام بھیجا جاتے؛

انجمن اسلامیہ کلکتہ چودہ سال سے حکومت کی سرپرستی میں چپ رہی ہو مسلم جماعت کے سربرآوردہ اشخاص اس کے ارکان ہیں ۲۰ اپریل کو ان کا ایک ڈیپوٹیشن نئے گورنر جنرل کا خیر مقدم کرنے گیا۔ بڑے لاٹ نے یقین دلایا کہ تیں انجمن سے پورا پورا تعاون کروں گا اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس کی مساعی کی بڑی تعریف کی۔ انجمن نے کتب خانہ قائم کر کے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کی جو کوشش کی ہی اسے بھی سراہا۔ کیوں کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلمان سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو گئے۔ لیکن اب یہ کمی پوری ہوتی جاتی ہی[۵۱]

بمبئی کی انجمنِ اسلامیہ ان میں سب سے زیادہ خوش حال ہی۔ یورپ سے سرسالار جنگ کی واپسی پر اس نے انھیں ایڈریس پیش کیا۔ پچاس ارکان موجود تھے جن کی قیادت قمرالدین طیب جی کر رہے تھے۔ سرسالار جنگ نے انجمن کا شکریہ ادا کیا اور اس کے مقاصد سے ہم دردی ظاہر کی۔ ۲۵ اگست کو وہ حیدرآباد روانہ ہوئے۔ وہاں ان کا بڑا شان دار استقبال ہوا[۵۲]

لکھنؤ کی انجمنِ اسلامیہ نے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے اپنا دستور اُردو میں شایع کیا ہی۔

---

۵۱ پنجابی ۶ مئی ۱۸۶۶ء

۵۲ Indian Mail ۱۵ و ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

کان پور میں انجمنِ تہذیب کے نام سے مسلمان یتیموں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ادارہ قائم ہوا ہو ثانوی مقصد مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال ہو۔ یہ انجمن اب تک کئی مسجدوں کی مرمت کر چکی ہو۔ حکومت نے جن مسلمان یتیموں کو عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دیا تھا وہ انجمن کو واپس مل جائیں گے اور ان کی پرورش و تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے گا۔[۱]

پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور لاہور کے کمشنر نے ایک ایسی خدمت انجام دی ہو جس سے مسلمان بہت خوش ہیں۔ لاہور کی سنہری مسجد عرصۂ دراز سے شکستہ و غیر آباد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ عوام نے بارہا حکومت سے اس کی مرمت کی درخواست کی تھی۔ مسجد کے زیرِ سایہ کوئی تیس دکانیں ہیں جن کا پانسو روپے سالانہ کرایہ حکومت کو ملتا ہو۔ لاہور کے باشندوں کی طرف سے حکام کی خدمت میں عرضی گزرانی گئی کہ یہ رقم مسجد کی مرمت میں صرف ہونی چاہیے۔ اب جاکر حکومت نے اس مطالبے پر غور کیا اور امید بندھ چلی ہو کہ یہ ساری رقم مسجد کی حفاظت میں لگائی جائے گی۔[۲]

پائنیر کے حوالے سے علی گڑھ اخبار نے لکھا ہو کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد سلطنتِ برطانیہ میں رہتی ہو۔ اکیلے ہندستان میں پانچ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ تنہا بنگال میں ترکی یا مصر سے

---

[۱] پنجابی ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۷۶ء

[۲] اودھ اخبار ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۶ء

[illegible]

اور کوشش ہو کہ ملتِ اسلامیہ میں اتحاد ہو اور منافقوں کا منھ کالا ہو۔"

اس کے باوجود حیدرآباد میں سُنّی اور شیعہ جماعتوں میں خون خرابا ہو گیا۔ سر سالار جنگ نے اس کے بعد فیصلہ کیا کہ ہنگامہ پرور پٹھانوں کو ریاست سے نکال دیا جائے۔ ان کی تعداد دس ہزار ہے اور یہ سنّی العقیدہ ہیں۔

ہندستان میں اسلام کی ترقی کی باڑھ رُکی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عام طور پر مرد اپنا مذہب بدلتے ہیں، عورتیں راسخ العقیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن سندھ میں الٹی گنگا بہ نکلی۔ وہاں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے[۵۱]

کٹیار کے ایک نوعمر ہندو نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بھائی بندوں نے اس کے استاد پر استغاثہ دائر کیا لیکن جب انھیں تین ہزار کی تھیلی مل گئی تو وہ چپکے بیٹھ رہے۔

پچھلے سال میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اخبار پنجابی کی یہ اطلاع کہ انگریزی میں اسلام کی موافقت میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں، ہو نہ ہو مسٹر اسمتھ کی تصنیف "محمدؐ اور اسلام" سے متعلق ہے۔ میرے قیاس کی تصدیق اودھ اخبار کے ایک مضمون سے ہوتی ہے[۵۲] جس کا عنوان "مسلمانوں کو مژدہ" ہے۔ اس میں ڈبلن یونی ورسٹی کے فاضل پروفیسر میر اولاد علی کا ایک خط درج ہے جو انھوں نے منشی نول کشور مالک اودھ اخبار کو تحریر کیا تھا۔ میر صاحب نے

ف۱ Indian Mail ۱۳ مارچ ۱۸۶۶ء

ف۲ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء

لکھا ہی کہ انگریز عالم وقتاً فوقتاً اسلام کی تائید میں جو کچھ لکھا کرتے ہیں، اس میں مسٹر بوسورتھ اسمتھ کی ایک کتاب کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ جس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ لیکن اہلِ ہند اب تک اس تصنیف سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے میر اولاد علی نے اسے اُردو میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا ہی۔ یہ پہلے اودھ اخبار میں جستہ جستہ شایع ہوگی اور بعد ازاں کتابی صورت میں۔ اپنے نوٹ میں ایڈیٹر نے لکھا ہی کہ: "گو کہ یہ سچ ہی کہ غیر مذہب والے ہمارے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، وہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ تاہم جب کوئی فرنگی تعصب کی عینک اتار کر انصاف سے ہمارے دین کا مطالعہ کرتا ہی تو ہمارا خوش ہونا فطری ہی۔ کیا اچھا ہو کہ ہندوستان کے انگریزی اخبار بھی رواداری کی روش اختیار کرلیں تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں اتحاد کا امکان پیدا ہو جائے"۔ اب میں سید اولاد علی کے مکتوب کا خلاصہ درج کرتا ہوں: "ہندو دھرم سے آپ کو جتنا بھی اُنس ہو، بجا ہی۔ لیکن آپ نے عربی، فارسی اور اُردو میں کتابیں چھاپ کر اہلِ ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً بڑا فائدہ پہنچایا ہی۔ آپ کی رواداری کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہی کہ آپ نے قرآن اور حدیثوں کے نئے ایڈیشن شایع کیے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں مسٹر اسمتھ کی ایک قابلِ قدر کتاب کے بعض حصے آپ کے اخبار میں اشاعت کی غرض سے بھیج رہا ہوں۔ جب ترجمہ ختم ہو جائے گا تو مصنف کی اجازت حاصل کرکے اسے کتابی صورت میں چھاپنے کا انتظام کیا جائے گا۔ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک دیس میں بستے ہیں اور ان میں

بھائیوں کا سا میل جول ہو۔ جب کوئی غیر ان کے مذہب پر منصفانہ نقطۂ نگاہ سے کچھ لکھتا ہو تو دونوں توجہ سے اسے پڑھتے ہیں۔ 'محمدؐ اور اسلام' کے نام سے لندن اور امریکہ میں جو کتاب شایع ہوئی ہو، اس کا بڑا چرچا ہوا ہو اور یورپ و امریکہ کے اخباروں نے اس کی تعریف کی ہو۔ مجھے امید ہو کہ اخبارِ عالم، پنجابی اور دیگر ممتاز اخبار میرے ترجمے کو نقل کریں گے اور شاید عیسائی جرائد بھی اس سے دریغ نہ کریں۔

مسٹر اسمتھ نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہو: تمہید، سیرتِ محمدؐ، اسلام، اسلام اور عیسائیت۔ انگریزی کے تمام چھوٹے بڑے اخباروں نے مصنف کی معلومات، صاف گوئی اور اندازِ تحریر کی جی کھول کر تعریف کی ہو۔ یہی وجہ ہو کہ میں نے مسلمان بھائیوں اور نیک نیت ہندستانی عیسائیوں سے اس کتاب کو روشناس کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ میرا منشا یہ بھی ہو کہ سر ولیم میور اس کتاب سے آشنا ہوں، کیوں کہ ہمارے مصنف نے جگہ جگہ ان کے اعتراضوں کا جواب بھی دیا ہو۔ خدا کا شکر ہو کہ تیرہ سو سال بعد ایک عیسائی مصنف پیدا ہوا جس نے انصاف کا دامن پکڑا ورنہ ہمارے خلاف کتنا زہر نہ اگلا جا چکا ہو۔"

اس کے بعد میر اولاد علی نے مختلف انگریزی اخباروں کے تبصروں کا ترجمہ دیا ہو جن میں مسٹر اسمتھ کی کتاب کو سراہا گیا ہو۔ وہ چاہتے تو کئی فرانسیسی اخباروں کی رائے بھی نقل کر سکتے تھے۔ میں نے ایک موقع پر اس کتاب کے حق میں رائے دی ہو۔

آخر میں چل کر میر صاحب نے لکھا ہو کہ: "مصنف کا اصل مقصد دینِ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنا ہو اور یہ کام انھوں نے بڑی دلیری سے انجام دیا ہو۔ دنیا کا پانچواں حصہ جس مذہب کو مانتا ہو اور جس کے ماننے والے کروڑوں آدمی برطانیہ کے زیرِ سایہ رہتے ہوں اس کی صحیح نمایندگی ازبس ضروری تھی اور مسٹر سمتھ نے بڑی قابلیت سے یہ فرض ادا کیا ہو۔"

گو کہ میر صاحب کو کہیں کہیں مسٹر سمتھ سے اختلاف ہی، لیکن انھوں نے بلا تکلف ہندستان کے تمام انگریز افسروں اور بالخصوص پادریوں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیا ہو۔ "محمدؐ نے رسول اللہ ہونے کا دعوا کیا اور اس دعوے کو ثابت بھی کیا۔ خدا کے ایک ہونے پر عیسائیوں کو بھی ایمان ہی۔ اگر وہ محمدؐ کو خدا کا رسول مان لیں تو ان میں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ اس معاملے میں انھیں مسٹر سمتھ کی پیروی کرنی چاہیے۔"

نیویارک یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈریپر نے اپنی کتاب 'سائنس اور مذہب کی کش مکش' میں پیغمبرِ اسلام کی بڑی تعریف کی ہو۔ وہ تو یہ بھی کہنے سے نہ چوکے کہ دنیا کو وحدت کا پیغام اسلام نے سنایا۔ یہ بات تو یاد رکھنے کی ہو کہ مسٹر ڈریپر مذہب کے معاملے میں آزاد خیال ہیں اور عیسائیت پر جا و بے جا اعتراض کر جاتے ہیں۔

'ظفر جلیل' نامی عربی کتاب کا اردو ترجمہ بمبئی سے شائع ہوا ہو۔ کتاب مبلغوں کے مطلب کی ہو اور اس کا ترجمہ قطب الدین دہلوی

نے کیا ہے۔ لکھنؤ سے عیسائیت کی رد میں ایک رسالہ بقلم محمد رکن الدین صاحب شائع ہوا ہے۔ اس کا نام 'اصولِ بطلانِ مذہب عیسیٰ' ہے۔

رُوس کے ایک جریدے نے لکھا ہے کہ ایشیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کی جدّوجہد جاری ہے۔ یہ سُن کر اُن جوشیلے عیسائیوں کو یقیناً مایوسی ہوگی جو اسلام کی فنا کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ یہ تحریک مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا ثبوت ہے۔ صرف ترکی ہی نہیں بلکہ بخارا، کاشغر وغیرہ ہر طرف اس کی ہوا چل رہی ہے۔ چین کے مسلمان چینی حکومت کا جُوا اتار پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں[1] دُور دراز کے صوبوں میں وہ ایک نئی بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں جس میں غیر مسلم قبیلے بھی ان سے تعاون کریں گے۔ اکیلے 'تن کن' کے شہر میں پچاس ہزار چینی مسلمان اور کم از کم دس مسجدیں ہیں[2] ہندستان میں بھی انھوں نے بڑا رعب جما رکھا ہے اور حکومت سے ہر قسم کی رعایتیں وصول کر لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف ان میں بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے اور اس میں یورپینوں سے نفرت کا شائبہ ضرور شامل ہے۔

والیِ کاشغر یعقوب خاں نے مومین کے گورنر کے بھانجے کی تجہیز و تکفین بڑے اہتمام سے کی۔ وہ تیس سرداروں کے ساتھ

۱؎ پنجابی ۱۲ جولائی ۱۸۶۹ء

۲؎ اودھ اخبار ۳۰ اپریل ۱۸۶۹ء

مسلمانوں کی آزادی کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہوا یعقوب خاں نے چین کے مہاجر مسلمانوں کو پناہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے[1]

پچھلے سال آغازِ نومبر میں لکھنؤ میں میرزا کلب علی خاں نے انگریزوں اور ہندستانیوں کے ایک شان دار جلسے میں یورپ کی سیاحت کے حالات سنائے۔ وہ ڈیڑھ سال یورپ میں رہ کر ابھی لوٹے ہیں۔ انھوں نے لندن، پیرس اور قسطنطنیہ کے جو دل چسپ حالات بیان کیے انھیں سن کر حاضرین محوِ حیرت رہ گئے۔ میرزا صاحب ان حالات کو قلم بند کر رہے ہیں۔

کلکتہ اور مدراس کے مسلمانوں نے سلطان ترکی خلیفہ عبدالعزیز کی فاتحہ خوانی کی رسم ادا کی۔ اس وقت انھیں معلوم نہ تھا کہ سلطان نے خودکشی کر لی ہے۔ کیوں کہ جب یہ خبر مشتہر ہوئی تو بمبئی کے قاضی نے فاتحہ خوانی کی ممانعت کر دی[2] وہاں کے مسلمانوں نے مرحوم کی بخشش کی دعا پر اکتفا کیا۔ اس لڑائی میں ہندی مسلمانوں کی ہمدردی ترکی کے ساتھ ہے اور انھوں نے ترکی کی مدد کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اودھ اخبار نے ان لوگوں کے نام چھاپے ہیں جنھوں نے اپنے جنگی فنڈ میں چندے دیے ہیں۔ ان میں سلطان اور سلطانہ کے نام پیش پیش ہیں جنھوں نے ایک لاکھ اور پچاس ہزار کے گراں قدر عطیے دیے ہیں۔ اخبار نے ہندی مسلمانوں سے اس فیاضی کی پیروی کی

---

۱ Indian Mail ۱۲ جولائی ۱۸۷۶ء

۲ ،، ۴ فروری ۱۸۷۶ء

اپیل کی ہی۔ بمبئی میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ملکۂ معظّمہ کو ایک عرضی بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اس میں حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ سلطنتِ ترکیہ کے حصّے بخرے کی تحریک کی مخالفت کرے۔ اس قسم کے جلسے کلکتہ اور دوسرے شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہی کہ ہندستان میں اسلام کی ترقی کا کیا حال ہی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہی کہ اپنی حکومت کے دوران میں مسلمانوں کی تعداد اتنی نہیں بڑھی جتنی اس وقت بڑھ رہی ہی۔ اور تو اور یورپین بھی مسلمان ہو رہے ہیں۔ اودھ اخبار اپنی ۲ جون سنہ ۲۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہی کہ لندن کے سٹی مجسٹریٹ مسٹر Pradiston نے اسلام پر ایمان لانے کا اعلان کیا ہی۔

دبدبۂ سکندری[1] کی اطلاع ہی کہ ایک سرکاری افسر جو رنگون سے آیا تھا کالی ۔ٹ۔ میں مسلمان ہوگیا۔

اودھ اخبار لکھتا ہی کہ سہاگ پور میں ایک مسلمان رمضان خاں پادریوں کے جھانسے میں آکر عیسائی ہوگیا تھا، اب وہ توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہوگیا۔

ایک دوسرے اخبار کی اطلاع ہی کہ لکھنؤ کے مضافات سے ایک آئرش نے مسلمان ہونے کی اجازت مانگی ہی!

لیکن سب سے تعجب خیز خبر یہ ہی کہ شملہ میں ایک نوجوان انگریز ہندو بن گیا اور جوگی ہو کر پہاڑ کے ایک مندر میں تپ جپ

[1] ۱۷ جولائی سنہ ۲۶ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (JESUIT) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بے کار اوہام کا طومار ہی تاہم یہ اوہام سماج میں اس طرح گھس بیٹھ گئے ہیں کہ یک بہ یک ان کی بیخ کنی نہیں کی جاسکتی۔ سب سے پہلے سماج سے جہالت کا اندھیرا دُور کرنا چاہیے تاکہ وہ خود ان اوہام کی حقیقت سے واقف ہو سکے۔ اس ماحول میں کوئی بہتر مذہب نہ پنپ سکے گا اور اگر اس کی اشاعت ہوئی بھی تو اس کی شکل ضرور مسخ ہو جائے گی۔ معلّموں کی حیثیت سے پروٹسٹنٹ پادریوں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ سرکاری مدرسوں سے ان کے اداروں کا مقابلہ کرنے سے صحیح حالت کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن گزشتہ تیس سال کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیجیے تو ان کی کارگزاری کا کچھ اندازہ ہوتا ہی۔ تعلیمی تحریک کی قیادت سراسر پادریوں نے کی ہی اور یہ مبالغہ نہیں کہ یورپین تہذیب اور تمدن کو ہندستان میں پھیلانے کا سہرا پادریوں کے سر ہی۔ اس کے باوجود ہندو مت پر حملہ کرکے پادریوں نے کوئی کامیابی حاصل نہ کی۔ ان پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ ہندستان کے باشندے یورپ کے مذہبی خیالات کو من وعن قبول نہ کریں گے۔ یہ سچ ہی کہ ہندو دھرم موجودہ شکل میں باقی نہ رہے گا، لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہی کہ اس کی جگہ عیسائیت نہیں لے سکتی۔ ہندستانی آگے چل کر کسی اپنے مذہب کا سہارا لیں گے جس کی بنیاد آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر ہو۔ باخبر نقّادوں کی رائے ہی کہ ہندستان کے عیسائی ادب میں آزاد خیالی کا افسوس ناک فقدان ہی۔ وہ قدامت پرستی کے بار سے بوجھل ہی۔ قیاس تھا کہ نو عیسائی شاید اجتہاد اور

Indian Mail

[illegible]

سے کچھ ہی کم ہی۔ اس لیے یہ امید عبث نہیں کہ ہندو جلد راہِ حق کی طرف آجائیں گے۔

بودھ مت اپنی انسانیت پروری کے لحاظ سے عیسائیت کے قریب ہی۔ لیکن غور سے دیکھیے تو اس میں دہریت اور فنا پرستی کے عناصر ہیں۔

لہٰذا اسلام ان دونوں گُم راہ کُن مذاہب سے بہت بہتر ہی۔ وہ وحدت اور سزا و جزا کا قائل ہی اور بہت سی باتوں میں عیسائیت سے قریب ہی۔ اسی لیے وہ اپنے کو دنیا کا واحد دینِ حق سمجھتا اور عیسائیت کو اپنا رقیب گردانتا ہی۔

پادری (Lightfoot) لائٹ فُٹ نے ایک رسالے میں اس خیال کی تردید کی ہی کہ پُرانے زمانے کے عیسائی مبلّغ اب کے مشنریوں کی بہ نسبت زیادہ مستعد ہوتے تھے۔ یہ سچ ہی کہ Xavier زے ویر نے آن کی آن میں پانچ لاکھ مدراسیوں کو عیسائی بنا لیا۔ لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ وہ زیادہ تر اچھوت تھے، زے ویر کی حمایت والیِ ریاست کر رہے تھے۔ اس نے ذات پات میں کھنڈت ڈالنے کی کوشش نہ کی اور یہ کہ اُدھر مسلمانوں کا عمل دخل نہ تھا۔ جہاں زندگی پر مذہب کی کار فرمائی ہو وہاں عیسائیت جلدی نہیں پھیل سکتی۔ لیکن آج کل کے زمانے میں اعلا طبقے کے ہندو اور مسلمان عیسائیت کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ صرف تعداد بڑھانے سے کیا ہوتا ہی اور اس نظر سے بھی دیکھیے تو ١٨٦١ء میں برما میں ساٹھ ہزار آدمی بہ یک وقت عیسائی ہو گئے۔ مختلف عیسائی فرقوں

کی باہمی رقابت سے کام ضرور بگڑ جاتا ہی۔ یہ بھی ہی کہ ہندستان میں
ماحول کے مطابق تبلیغ کا انداز بدل دینا چاہیے۔

انجیل کا پیرایۂ تحریر یک سر مشرقی ہی اور یہ بڑی اچھی بات ہی
کیوں کہ ہندستانیوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں رہتا کہ "یہ کوئی مغربی یا
فرنگی مذہب ہی۔"

دہری (بہار) میں ڈاکٹر رائے کو بڑی دھوم دھام سے بپتسما
دیا گیا۔ پشاور میں ایک راج پوت عیسیٰؑ کی ملت میں شامل ہوگیا۔
لیکن ہم نے سب سے بڑا معرکہ ایک برہمن کو عیسائی بنا کر سر کیا۔
اس کا نام 'سبرا سینیم' ہی اور اس کا شجرۂ نسب تین ہزار سال تک
چلا جاتا ہی۔ عیسائی ہوتے ہی اس نے چوٹی اور زنار کو خیرباد کہا۔
ان واقعات کے ذکر نے بابو گلیندر (مگیندر؟) موہن ٹیگور کی
یاد دلائی جن کے عیسائی ہونے پر سارے ملک میں سنسنی پھیل
گئی تھی۔ ان کے باپ نے جو ہندوؤں کے جیّد عالم اور کئی کتابوں
کے مصنّف ہوتے ہیں، ان سے قطع تعلّق کر لیا۔ پچھلے سال مجھے
اس معزز نو عیسائی اور اس کی دونوں بیٹیوں سے پیرس میں ملنے
کا اتّفاق ہوا۔ خوش قسمتی سے باپ کی وصیت غیر قانونی نکلی اور
اس کے انتقال کے بعد بابو صاحب کو بہت بڑی جایداد ورثے
میں مل گئی۔ میں نے انگریزی میں لکھا ہوا ان کا ایک رسالہ
پڑھا ہی جو لندن سے شایع ہوا ہی۔ اس میں ان کے ایمانِ راسخ
کی جھلک ملتی ہی اور اس امید کا اظہار نظر آتا ہی کہ ہندستان
بہت جلد عیسیٰؑ کے نور سے جگ مگا اٹھے گا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پادری کلارک کی عنایت سے مجھے پنجاب کی اُس انجمن کی سالانہ رپوٹ دست یاب ہوئی ہے جس کا مقصد مذہبی کتابوں کی اشاعت ہے۔ پادری صاحب اس کے سکریٹری ہیں۔ رپوٹ میں کئی مشہور ہندو نو عیسائیوں کا ذکر ہے مثلاً پادری چیٹرجی، داؤد سنگھ، چندو لال، بابو رادھا رکھ۔ لیکن مسلمان صرف ایک ہے — پادری عماد الدین۔ میں انجمن کے مالی معاملات کا ذکر نہ کروں گا۔ اس کی ادبی کارگزاری کا تعلق ہندی اور اُردو دونوں سے ہے۔ سب ملا کر اُردو کی تقریباً سات ہزار کتابیں اور ساڑھے آٹھ ہزار رسالے — اور ہندی کی دو ہزار کتابیں اور ساڑھے چھ سو رسالے فروخت ہوئے۔ رپوٹ کے مرتب کا بیان ہے کہ پنجاب میں ہندی کا رواج برائے نام ہے۔ اور انجمن آیندہ اس زبان میں کوئی چیز شائع نہ کرے گی۔

پچھلے دنوں جو قابلِ ذکر کتابیں یا رسالے چھپے ہیں، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:-

سنت چتو کی حکایت کی شرح۔ حجم ۱۴۰ صفحات

مسیح ابن اللہ — پادری Vangen کی کتاب کا ترجمہ۔ حجم ۱۵۶ صفحات۔

چند جوانوں کا قصہ۔

جھوٹے اور سچے تعبیر گویوں کا قصہ۔

اس بیان کو میں زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ لیکن جو کتابیں زیرِ طبع ہیں ان میں "گیت مالا" کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پادری Ulman اُلمان نے بڑی محنت سے انگریزی کی حمدوں اور بھجنوں

کا ترجمہ ہندستانی نظم میں کیا ہے۔ اُردو کی بہترین تصنیفات کے صلے میں جو انعامات تقسیم ہوا کرتے ہیں ان میں سے پانچ سو رُپے کا انعام اس کتاب کے مصنف کو ملا ہے۔

'مسیحی القاب' کی تصنیف ایک دوسرے پادری نے کی ہے۔ اسے دو سو کا انعام مرحمت ہوا ہے۔

زیرِ طبع کتابوں Thomas a Kempis کی مشہورِ عالم کتاب Imitation of Christ کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ Confessions of St. Augustiru بھی اُردو میں منتقل کی جا رہی ہے

ہندستان میں عیسوی تعلیم کی ترویج کی غرض سے لندن میں جو کمیٹی بنی ہے اس کا سالانہ جلسہ گزشتہ ۷ مئی کو لارڈ Shafts Bury شیفس بری کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس میں جو رپوٹ پڑھی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندستانی بچوں کی تعلیم کے لیے ہندستانی معلّم رکھے گئے ہیں اور ان کی مذہبی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ہندستانی اور دوسری اہم ملکی زبانوں میں کمیٹی کی طرف سے مفید کتابیں شایع کرنے کا انتظام ہے۔ ہندستانی مدرّسوں کی تعداد ۱۲۸ اور طلبا کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ پچھلے سال کمیٹی کی طرف سے ۱۱۶ کتابیں چھپیں اور ان کے پانچ لاکھ نسخے تقسیم کیے گئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانی کلیسا کو قطعی طور پر ملکی بنا دینا چاہیے۔ اسے کسی غیر ملکی کلیسے کے زیرِ نگیں رکھنا مناسب نہیں۔

اخبار پنجابی کے نامہ نگار نے لکھا ہے[۱]: " اگلی ۷ مئی کو چاند پور میں

[۱] ۸ اپریل ۱۸۶۶ء

ایک بہت بڑا میلہ لگے گا جس میں ہندستان کے مختلف مذاہب کے نمایندے جمع ہوں گے اور اپنے اپنے اصول بیان کریں گے۔ اس طرح لوگ دوسروں کے خیالات اور رایوں سے واقف ہوسکیں گے اور اپنے مذہب کا دوسروں سے مقابلہ کرسکیں گے۔ میلے میں بہت سے لوگ جمع ہوں گے اور لین دین کا بازار بھی گرم ہوگا۔ اس میلے میں شرکت سے دینی اور دنیوی دونوں فائدے ہوں گے۔ ہر سال اس قسم کے اجتماع کا انتظام کیا جارہا ہے۔" اگر میلے میں اس قسم کا مناظرہ ہوا تو عیسائیوں کا سراسر فائدہ ہے۔

پنجابی[1] نے ہندستان کے مختلف مذاہب پر ایک مضمون شایع کیا ہے جو غالباً کسی وہابی کا لکھا ہوا ہے۔ میں اسے یہاں نقل کرتا ہوں: "مذہب بہت بڑی نعمت ہے۔ لامذہب کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ کوئی ایمان۔ اچھا مذہب سکونِ قلب کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں میں بھلے بُرے سبھی ہوتے ہیں لیکن ان کی کمی اور زیادتی سے بڑا فرق ہوجاتا ہے۔ ہر مذہب کے اصولوں میں حالات کے مطابق تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ تحریریں نہیں تو عمل میں یہ تبدیلی ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بانیِ مذہب کا اصل منشا بہت کم سمجھ میں آتا ہے اور عوام سے صرف ایمانِ راسخ کی توقع کی جاتی ہے۔"

اب ہم انصاف سے ہر مذہب کے حسن و قبح کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنی صاف گوئی کے لیے معافی طلب ہیں:

---

[1] ۱۰ جون سنہ ۷۶ء

[illegible]

کے پجاری ہیں۔ ایک فرقہ وحدت پرستوں کا بھی ہو جو عیسیٰ کو رسول مانتے ہیں، ابن اللہ نہیں مانتے۔ یہ فرقہ اسلام سے بہت قریب ہو۔ اسی وجہ سے متعصب عیسائی اسے اسلام دوستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔ ان کے ایمان کی بنیاد عقل اور عمل ہو۔ اصولاً ان کی بہت سی باتیں صحیح ہیں، لیکن اب ان کی ملت میں لا مذہبیت کا عمل دخل ہوتا جاتا ہو۔

(۴) اسلام: شیعہ اور سنیوں میں بنیادی فرق ہو۔ اس کی اصل تو کچھ نہیں لیکن بعد میں تعصب کی وجہ سے یہ خلیج وسیع ہوتی گئی۔ اسلام نے ساری دنیا میں اُجالا کر دیا تھا لیکن اس کے پیروں نے تن آسانی اور لاپروائی کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اسلام کا سنگِ بنیاد وحدت کے اصول پر رکھا گیا ہو۔ لیکن مسلمان نہ قرآن سمجھتے ہیں اور نہ اس کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔ وہ حدیث اور امامت کے جھگڑوں میں پھنس کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان میں زیادہ تعداد سنیوں کی ہو۔ یہ بھی دو حصّوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو پُرانے اماموں کو مانتے ہیں اور دوسرے 'وہابی' جو اللہ اور قرآن کے سوا کسی کے قائل نہیں وہابی تعداد میں کم ہیں لیکن اصول اور عمل کے سچے ہیں۔ البتہ یہ یہودیوں کی طرح مذہب میں ظاہرداری کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ بہرحال ان کا مستقبل روشن ہو۔ شیعہ مذہب تنزل اور پستی کی حالت میں ہو۔

(۵) تصوّف: اس کے ماننے والے سبھی ملتوں میں ملیں گے۔ یہ روحانی تہذیب کے قائل ہیں اور ان میں مذہبی تعصب کا شائبہ

بھی نہیں ہوتا۔

یہ سچ ہے کہ اس وقت مسلمان ذلیل وخوار ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرآن کی تعلیم انسان کو بہتری اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ یوں تو ہر بانیِ مذہب کے بعد تفرقے کا بیج پڑ جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد عیسوی مذہب کی یہی حالت ہوئی۔ مسلمانوں میں خلافتِ راشدہ کے زمانے میں پھوٹ کا بیج پڑ گیا۔ رشک وحسد کا زہر خون آشامی کی شکل میں ہویدا ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔ لیکن کیوں کہ اسلام کے متعلق قرآن کریم حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے لہٰذا اس کا شیرازہ منتشر نہ ہوا۔ یہ بدعت ضرور پیدا ہو گئی کہ جن ملکوں میں عربی نہ سمجھی جاتی تھی وہاں مُلّا مذہب کے اجارہ دار بن بیٹھے اور انھوں نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اپنے حلوے مانڈے کے لیے انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔

جب مسلمان حکمراں عیش وعشرت کے بندے بن گئے تو علم کا زوال اور جہالت کا بول بالا شروع ہوا اور اس کے ساتھ جاہل ملّاؤں اور خود پرست فقیہوں کے دور کا آغاز ہوا۔

اب قرآن کا مستند ترجمہ اُردو میں شایع ہو چکا ہے اور ہر مسلمان اسے سرمۂ بصیرت بنا سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد کسی تاویل کی گنجایش نہ رہے گی اور مسلمان مذہبی معاملات میں روحانی دلّالوں کے محتاج نہ رہیں گے۔ کاش مسلمان اور عیسائی آپس میں بھائی چارے کا رشتہ پیدا کریں اور اُن کے اتحاد سے دنیا میں امن وانصاف قائم ہو۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے بارے میں ان کی تحقیق کم اہم نہ تھی اور امید ہو کہ ان کے لائق فرزند ان مسودوں کو مرتب کر دیں گے۔ ڈاکٹر ولسن کے جنازے کے ساتھ ہر قوم کے لوگوں کا مجمع تھا اور شاہزادۂ ویلز کا نمایندہ بھی جلوس کے ہم راہ تھا۔

اسی منحوس مہینے میں مہاراجا دلیپ سنگھ کے اتالیق پنڈت رادھاکشن نے رحلت فرمائی۔ گو وہ سنسکرت کے بہت بڑے پنڈت تھے لیکن اُردو کے بھی مانے ہوئے عالم تھے۔ شاعری میں 'شنکر' تخلص کرتے تھے اور اسی نام سے تذکروں میں ان کا ذکر آیا ہو۔

انھی دنوں اُردو کے مشہور شاعر منشی ظہیر الدین خاں ناظر کا انتقال ہو گیا۔ اودھ اخبار نے یہ ماتم افزا خبر چھاپ کر وعدہ کیا ہو کہ کسی آیندہ اشاعت میں ان کی تصانیف کی فہرست درج کرے گا۔

اسی زمانے میں ستر سال کی عمر میں Edward Thornton ایڈورڈ تھارٹن صاحب ہم سے بچھڑ گئے۔ وہ مدتوں تک Allen's Indian Mail ایلنز انڈین میل کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ علاوہ برایں ایسٹ انڈیا بورڈ کے سکریٹری بھی تھے۔ سندھ کا گزیٹیر انھوں نے ہی مرتب کیا تھا اور ہندستان میں مشرقی سلطنت کی تاریخ کے مصنف تھے۔ ان کتابوں کی وجہ سے انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔

اسی دسمبر کے مہینے میں شہرۂ آفاق ماہرِ مشرقیات 'فرانس جونسن' نے اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ فارسی زبان کی بہترین ڈکشنری انھی کی محنت کا نتیجہ ہو۔ یہ عربی و اُردو کے طلبا کے لیے بھی مفید ہو

افسوس کہ یہ لغت اب نایاب ہوگئی ہے۔ نوجوانی میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کالج واقع ہیلیبری میں سنسکرت، بنگالی اور تلگو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تیس سال تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی اور ان کی جگہ پروفیسر مونیر ولیم مقرر ہوئے جو اب آکسفوڈ میں سنسکرت کے استاد ہیں۔ وہ بے مثل زبان داں تھے اور انھوں نے حیرت انگیز حافظہ پایا تھا۔ مہابھارت کے انتخاب کے علاوہ انھوں نے میگھ دوت اور ہت اپدیش کا سنسکرت سے ترجمہ کیا اور گلستاں کو فارسی سے انگریزی میں منتقل کیا۔

سالِ رواں کی چوتھی جنوری کو پیرس میں موسیے JULE MOHL یولس مُہل کا انتقال ہوگیا۔ موصوف رآئل ایشیاٹک سوسائٹی کے سکریٹری اور صدر رہ چکے تھے۔ گو وہ ہندستانی نہ جانتے تھے لیکن مشرق سے انھیں بے حد محبت تھی اور مشرقی علوم کے متعلق ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

۷ مارچ کو کلکتہ سے بشپ ڈاکٹر ملین کا یک بہ یک انتقال ہوگیا۔ اپنے سالانہ مقالوں میں کئی بار ان کا ذکر کرچکا ہوں۔ وہ ہندستانی اور بنگالی میں وعظ کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ وہ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور ان کی رہنمائی میں عیسائیت نے ہندستانی میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ اپنی مصروفیتوں کے باوجود انھیں ادب سے شغف تھا اور ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ بیماری کی حالت میں وہ محض ادائے فرض کے لیے پنجاب کے دورے پر نکل گئے وہیں راولپنڈی میں بیمار ہوکر انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

نہیں سمجھا جاتا لیکن حقیقت میں وہ اپنی رعایا کے محسن تھے۔

گزشتہ مئی میں شہرہ آفاق عالم سنسکرت Christian Lassen کرسچین لے سن کا انتقال ہوگیا۔ وہ ناروے کے رہنے والے تھے لیکن جرمنی میں رہ گئے تھے اور وہاں کی بون یونی ورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ جرمنی نے سنسکرت لسانیات میں جو نام پیدا کیا، اس کی ابتدا اسی عالم سے ہوئی۔ پراکرت گرامر کے مؤلف کی حیثیت سے انھوں نے خاص شہرت حاصل کی۔

۳ جون کو سوئٹزر لینڈ میں رگاٹز کے مقام پر ڈاکٹر مارٹن ہوگ کا انتقال ہوا۔ سنہ ۵۸ء سے لے کر سنہ ۶۵ء تک وہ پونہ میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور وہاں انھوں نے پہلوی زبان کا غائر مطالعہ کیا۔ اس پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن پر میں تبصرہ کرچکا ہوں۔ سنسکرت کے علاوہ ہندستانی سے بھی انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اسلام پر بھی ان کی ایک کتاب ہے جو حکومتِ بمبئی کے ایما پر آج سے چھ سال پہلے چھپی تھی۔ یورپ لوٹنے کے بعد وہ میونخ یونی ورسٹی میں سنسکرت اور پہلوی کے استاد مقرر ہوئے۔

۲۵ جولائی کو نامور ماہر ہند 'رابرٹ چلڈرس'، نے صرف ۳۸ سال کی عمر میں رحلت کی۔ سنگلی اور پالی زبانوں پر انھیں کامل عبور حاصل تھا۔ انڈیا آفس لائبریری میں قدیم علمی کتابوں کی حفاظت ان کے ذمے تھی۔ افسوس کہ ایسا ہونہار عالم عین جوانی میں اس دنیا سے اٹھ گیا۔

۱۰ اگست کو انگلستان میں عربی زبان کے مشہور عالم ایڈورڈ ولیم لین ۷۵ سال کی عمر میں مر گئے۔ عربی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے وہ عرصۂ دراز تک مصر میں رہے۔ اسی وجہ سے ان کا لب و لہجہ اتنا شستہ تھا کہ عربوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ان کا 'الف لیلہ' کا ترجمہ مستند ہے اور مصر کے آداب و رسوم پر ان کی کتاب نہایت پُرلطف ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے عربی فارسی لغت ہے۔ اس کی پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں، چھٹی جلد زیرِ طبع ہے اور آخری دونوں جلدوں کے مسودے تیار ہیں۔ وہ مخلص عیسائی تھے لیکن مسلمانوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ عبرانی سے واقف تھے، لہٰذا اصل زبان میں انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔

یکم ستمبر کو اخبارِ عالم میرٹھ کے مدیر و مالک میرزا محمد وجاہت علی خان اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ ہندستانی اخبار نویسوں میں انھیں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ وہ میرے مہربان تھے اور بہت عرصے سے اپنا اخبار مجھے بھیجتے تھے۔ ان کی صاف گوئی اور رواداری کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ اس امر کا بھی افسوس ہے کہ ان کے بعد اخبار اور چھاپے خانے کا چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی عمر صرف چار سال ہے۔

کن کن کا ذکر کیا جائے۔ ایسے کتنے ہی جگر خراش واقعات ہیں۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پڑھا جائے گا۔

شاہی اعلان کے متعلق میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ تمام اخباروں نے اس پر رائے زنی کی ہے۔ مغلوں کی پرانی راج دھانی میں بڑے کرّ و فر سے یہ اعلان سنایا گیا اور ہندستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں یہ تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ کلکتہ میں جو انگریزوں کی راج دھانی ہے، یہ اعلان انگریزی، ہندستانی اور بنگالی میں مشتہر کیا گیا کیوں کہ بنگال میں ان تینوں زبانوں کا چلن ہے۔ کلکتہ کے باشندوں کی طرف سے جو ایڈریس ملکۂ معظمہ کی خدمت میں بھیجا گیا وہ بھی انھی تینوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔

اخبارِ انجمنِ پنجاب کا بیان ہے کہ آیندہ ملکہ کے تمام احکام میں 'قیصرِ ہند' کا لقب درج ہوگا۔ دلّی دربار میں جو اسناد تقسیم ہوتی ہیں، ان میں بھی انگریزی و اُردو میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ لفظ 'قیصر' 'سیزر' سے نکلا ہے۔ لیکن اسے یک سر یورپین نہ سمجھنا چاہیے گو کہ یہ روم کے بادشاہوں کا خطاب تھا۔ مشرقی زبانوں میں بھی اس کا چلن ہے۔ حکیم مومن خاں کی ایک نعت میں لفظ 'قیصر' کا استعمال ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ 'قیصر' کی بہ نسبت 'شہنشاہ' اس ملک میں زیادہ مقبول ہے۔ لیکن اس کا مطلب 'شاہوں کا شاہ' ہے اور ہندستان میں کوئی 'شاہ' نہیں ہے۔ ہندستانی اخباروں نے لکھا تھا کہ سب سے پہلے ہندستانی رئیسوں کو 'بادشاہ' کا خطاب ملے بعد ازاں والیِ انگلستان 'شہنشاہ' کا لقب اختیار کرے۔

لیکن حکومتِ برطانیہ کو یہ تجویز پسند نہ آئی اور اس نے دیسی راجاؤں کی عزت افزائی مناسب نہ سمجھی۔ لہٰذا ملکہ کو شہنشاہ کہنے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اگر میں دلّی دربار کا حال لکھنے بیٹھوں اور ان مقامی درباروں کا چرچا کروں جو قیصرِ ہند کے اعزاز میں سارے ملک میں ہوئے تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی۔ اودھ اخبار نے ۱۲ نومبر ۱۸۷۶ء کو دربار کے انتظام کی اجمالی کیفیت بیان کرنے کے لیے جو ضمیمہ شایع کیا تھا وہ بڑے سائز کے ۳۶ کالم سے کم طولانی نہ تھا۔

شاہی اعلان کے موقع پر کئی اسلامی انجمنوں نے وائس رائے کی خدمت میں ایڈریس پیش کیے۔ ان میں انجمنِ ادب دلّی، انجمنِ پنجاب، انجمنِ اسلام بمبئی اور انجمنِ ادب بنگال قابلِ ذکر ہیں۔ انجمنِ پنجاب کی طرف سے اس کے صدر ڈاکٹر لائیٹز نے سپاس نامہ گزارا۔ وائس رائے نے جواب میں کہا کہ لاہور یونی ورسٹی سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ موجودہ صدر کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو اعزازی ڈگری دے کر ویینا یونی ورسٹی نے سارے ہندستان کی عزت افزائی کی ہے۔

ملکہ کا نیا خطاب سرکاری طور پر اُردو میں 'قیصرِ ہند' طے پایا ہے۔ لیکن ہندی میں اس کا ترجمہ 'ہند کا قیصر' کیا گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ 'ہند کی قیصر' کہا جاتا تو بھی ایک بات تھی۔ شاید اس امر کے پیشِ نظر کہ ولی عہد کبھی نہ کبھی بادشاہ ہوں گے یہ بدعت گوارا کی گئی ہے۔ دربار کے زمانے میں ملکہ کے جو نئے سکے لٹائے گئے ان میں بھی

لکھا ہوا تھا۔

یہ خبر خوشی سے سُنی جائے گی کہ اس تقریب میں لارڈ لٹن نے تیموریہ گھرانے کے اُن افراد میں پانچ ہزار رُپے تقسیم کیے جنھیں ماہانہ وظیفہ نہیں ملتا ہے۔ پنجابی نے اس عطیے کا ذکر "دلّی کے شاہی گھرانے پر نگاہِ کرم" کے عنوان سے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:[1] "اس بدنصیب گھرانے سے حکومت کو زیادہ فیاضی برتنی چاہیے۔ برما کے مختلف شہروں میں شاہی خاندان کے بارہ تیرہ افراد ہیں۔ دلّی کے شاہ زادوں کی بہ نسبت انھیں کچھ زیادہ مل جاتا ہے۔ لیکن برما جیسے اجنبی ملک میں ۲۵ رُپے پر گزراوقات کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے۔ سب سے زیادہ پنشن شاہ زادہ جواں بخت کو ملتی تھی[2] انھیں ساڑھے تین سو اور ان کی والدہ اور بیوی کو ڈھائی ڈھائی سو ملتے تھے۔ سات آٹھ سال پہلے کی بہ نسبت ان سے بہ ہر حال بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں تو یہ بے چارے ایک کال کوٹھری میں بند رکھے جاتے تھے[3]" اُدھر میرزا الٰہی بخش کی پنشن میں ڈھائی سو رُپے سالانہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔

سالِ رواں کی ۸ جنوری کو وائس رائے ہند لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ علی گڑھ اخبار نے اس

---

[1] ۹ جون ۱۸۷۳ء [2] علی گڑھ اخبار (۲۰ اکتوبر ۱۸۷۲ء) کا بیان ہے کہ میرزا جواں بخت کی صاحب زادی کی شادی شاہ زادہ حسن سے ہوتی ہے۔ شادی کے اخراجات کے لیے حکومت نے دس ہزار رُپے دیے۔

[3] رنگون گزٹ کے حوالے سے انڈین میل میں بہ تاریخ ۲۹ جنوری ۱۸۷۳ء

تقریب کی پوری تفصیل شایع کی ہی اور وہ تقریریں بھی [illegible] کی ہیں جو ہندستانی اور انگریزی میں ہوئی تھیں[1] مجلسِ انتظامیہ کی طرف سے جو سپاس نامہ پڑھا گیا اس میں کالج کی تحریک پر حکومت کے لطف وکرم کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اس پر مجلس کے صدر لطف علی خاں اور سکریٹری سید احمد خاں کے دست خط تھے۔ سپاس نامے میں سابق گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک، سر ولیم میور اور سر جان اسٹریچی کا خاص طور پر ذکر تھا۔ اُن انگریزوں کا بھی شکریہ ادا کیا گیا تھا جنھوں نے انگلستان میں کالج کے لیے چندہ جمع کیا۔ ان میں لارڈ اسٹینلے کا نام کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اب ذرا اس مضمون کی داد دیجیے جو "سالِ نو" کے عنوان سے پنجابی نے چھاپا ہی[2]: لاکھ لاکھ شکر ہی اس خدائے پاک کا جس نے پچھلے سال ہم پر اپنی رحمت کا سایہ کیا اور ہمیں جملہ آفات سے محفوظ رکھا۔ اس پروردگار کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو زندگی کا کیا بھروسا۔ یہ تو راستے کا چراغ ہی جسے ہر طرف سے ہوا لگتی رہتی ہی، معلوم نہیں کون سا جھونکا کب اسے بجھا دے۔ اس کے آنی جانی ہونے ہونے میں بھلا کسے شک ہو سکتا ہی۔ ہمارے سامنے کتنوں کے چراغِ زندگانی گُل ہو جاتے ہیں پھر بھی ہماری آنکھ نہیں کھلتی اور ہم مرتے مرتے بھی زندگی کو یاد کرتے ہیں۔ لیکن کسی فرصت کے لمحے میں جب ہم اپنے نیک وبد کا حساب کرتے ہیں تو چپکے سے یہ مان لینا پڑتا ہی کہ اللہ کے دربار میں ہم خالی ہاتھ جا رہے ہیں۔

---

[1] ۱۲ جنوری [illegible]ء [2] ۸ جنوری [illegible]ء

[illegible]

لوگوں کی خواہش ہے کہ جب تک دلّی برطانوی راج کی راج دھانی نہیں ہوتی، کم از کم گرمیوں وائسرائے شملہ کے بدلے وہاں رہیں۔ پنجابی اس ضمن میں لکھتا ہے[1] "بہت غور و خوض کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ دارالسلطنت کے لیے دلّی سے زیادہ کوئی موزوں شہر نہیں...... جب انگریز بڑی ہوشیاری سے ہندستان میں داخل ہوئے تو انھوں نے کلکتہ کے مضبوط قلعے کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہت چند روزہ ہوتی تھی اور مسافر سرِ راہ لُٹ جاتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک محفوظ مقام ڈھونڈ نکالا جسے آسانی سے قلعہ بند کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ سمندر کے کنارے بھی تھا اور وہاں جہاز آ جا سکتے تھے اور یورپ سے تعلق رہ سکتا تھا۔ جب تک مقصد تجارت تھا کلکتہ ایک گودام رہا۔ لیکن جب مقصد ملک رانی قرار پایا، اسے قلعہ بند کر لیا گیا.....

اب ہندستان انگریزوں کے زیرِ حکومت ہے۔ دنیا کے سب ملک اپنے حکمراں کو شہنشاہ کہتے ہیں۔ ہندستان کے راجا نواب فقط ان کے خراج گزار ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی محکومی میں اپنی عزّت سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اس کے زیرِ سایہ وہ حفاظت اور سلامتی میں ہیں اور ہرگز اس کی تبدیلی کا خیال دل میں نہیں لا سکتے۔ جب یہ سب ہے تو راج دھانی بھی دلّی میں ہونی چاہیے۔ کلکتہ بالکل ہٹ کر ہے اور ریل اور تار نے اب اتنی آسانی پیدا کر دی ہے کہ کلکتے کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔ یوں بھی کلکتہ کا نام ہی

[1] ۱۰ نومبر ۱۸۶۷ء

نام ہی۔ کیوں کہ چھ مہینے حکومت کا صدر مقام شملہ ہوتا ہی۔ گرمیوں میں پہاڑ پر چڑھ گئے اور جاڑوں میں نیچے اتر آئے۔ غریب منشیوں کی جان اس آ جا ے پریشان ہو۔ جاڑوں میں بھی بڑے لاٹ دؤرے پر نکل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کلکتہ تجارتی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہی۔ گیس کی روشنی ہی اور نل کا پانی ہی۔ لیکن گرمی کا حد و حساب نہیں اور ہمیشہ وباؤں کا دؤر دؤرہ رہتا ہی۔ مانسون کے دنوں میں ملیریا کا وہ زور ہوتا ہی کہ توبہ۔ بنگالیوں کی رنگت اسی وجہ سے کالی ہو جاتی ہی۔ انگریز بھی وہاں زیادہ عرصے رہنا پسند نہیں کرتے۔ جو وہاں بس جاتے ہیں ان کا رنگ جھلس جاتا ہی، جسم دبلا پڑ جاتا ہی اور طبیعت میں بودا پن آ جاتا ہی۔ کلکتہ سے لوٹ کر اپنے گھر جاتے ہی ان کے چہرے تندرستی سے چمکنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ بڑے بڑے سرکاری افسر کلکتہ میں رہنا نہیں چاہتے۔
مشکل یہ ہی کہ تمام رئیسوں کو وائس رائے سے ملنے جانا ہوتا ہی۔ زرا بمبئی، سندھ یا پنجاب سے کلکتہ کا فاصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ اسی لیے وہ لوگ کلکتہ سے کتراتے ہیں۔ کوئی خاص ضرورت ہوئی، تبھی اُدھر کا رُخ کرتے ہیں۔"

اسی موضوع پر پنجابی نے کئی مضمون چھاپے ہیں۔ ان میں سے ایک میں لکھتا ہی: "اہلِ رائے حضرات ایک زبان سے دلی کو راج دھانی بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لاہور کے انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے بھی ہماری تائید کی ہی۔ اس نے کہا

ہو کہ اس تبدیلی سے سراسر حکومت کا فائدہ ہوگا۔"

ایک طرف تو دلّی کے گن گائے جا رہے ہیں، دوسری طرف دلّی کالج کو پنجاب یونی ورسٹی سے ملحق کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یونی ورسٹی کی اہمیت بڑھانے کے سوا کچھ نہیں[1]۔ عام طور پر اس فیصلے کی مخالفت کی گئی ہے۔ دلّی والوں نے اپنے دل کی بھڑاس نظموں میں نکالی ہے۔ لاہور کے سرکاری چھاپے خانے کے ناظم مولوی محمد سعید نے ایک مخمّس میں اور اشرف دہلوی نے ایک ترجیع بند میں اس کا خوب مذاق اڑایا ہے۔

مملکتِ اودھ کو صوبہ جاتِ شمال و مغرب میں شامل کر دیا گیا ہے اور ان کا دارالسلطنت الہ آباد میں قرار پایا ہے۔ کہنے کو اودھ کا صدر مقام اب بھی لکھنؤ رہے گا۔

(۲)

اس سال بھی اُردو اور ہندی میں بے شمار کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے میں رامائن کے منتخب حصّوں کے انگریزی ترجمے کا ذکر کرتا ہوں[2]۔ ترجمہ مسٹر گراؤز نے کیا ہے۔ کتاب کو انھوں نے بڑے سلیقے سے مرتّب کیا ہے اور تشریح طلب مقاموں پر نوٹ بھی دیے ہیں۔ امر پرکاش سنگھ نے رامائن کا جو ترجمہ کیا تھا وہ لکھنؤ

---

[1] [illegible] ۲۶ مارچ [illegible]

[2] مجھے والمیک کی رامائن کے فارسی ترجمے کا خیال آتا ہے جو ۱۸۶۱ء میں آگرہ سے شایع ہوا تھا۔

یں چھپ رہا ہے[1] یہ سترھویں صدی کے آخری سالوں میں تیار ہوا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ مترجم کا اصل نسخہ اب تک محفوظ رہا اور پنڈت مدھو پرشاد کی وساطت سے طباعت کے لیے دست یاب ہوا۔ مرتب کا بیان ہے کہ ترجمہ گو منظوم ہے تاہم اپنی روانی اور بے ساختگی میں بے مثل ہے۔ اصل نسخے کا کاغذ بہت خستہ ہو گیا تھا، اس لیے نقل کی تلاش ہوئی۔ جب کوئی نقل نہ ملی تو بڑی کاوش سے اس واحد نسخے کو درست کیا گیا۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کی قدر کریں گے۔

مسٹر گراوز نے مشہور ہندو بھگت اور شاعر سوامی ہری داس پر ایک دل چسپ مضمون لکھا ہے۔ ان کا ماخذ 'بھگت مال' نامی نایاب کتاب ہے۔ ان کی دو ہندی نظمیں بھی درج کی ہیں جن میں وشنوی اصولوں کی تشریح ہے۔

ڈاکٹر Trumpp آدی گرنتھ کا جو ترجمہ کر رہے تھے اس کا میں کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں۔ مقامِ مسرت ہے کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا۔ میں وزیرِ ہند کا ممنون ہوں کہ اس کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمایا۔ یہ آٹھ نو صفحات کی ضخیم کتاب ہے اور جلد دیدہ زیب ہے جو حکومت کے خرچ سے شایع ہوئی ہے۔

پادری Hoernle کی لکھی ہوئی 'پوربی ہندی کی گرامر' بھی چھپ گئی۔ یہ سنسکرت اور ہندی کے شائقوں کے لیے یکساں مفید ثابت ہوگی۔

پادری Warren وارن نے اُردو میں عبرانی زبان کی جو گرامر لکھی ہے وہ چھپ رہی ہے۔ موصوف عبرانی اور اُردو کی جو

[1] اودھ اخبار ۲۵ مارچ سنہ ۶ء

ڈکشنری تیار کر رہے تھے وہ نامکمل رہ گئی۔

مجھے امید ہے کہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے چند بردائی کی رزمیہ نظم کو چھاپنے کا ارادہ ترک نہیں کیا ہے۔ سر ہینری الیٹ کے پاس اس کے تین نسخے ہیں۔ ایک کتب فروش سے انھوں نے یہ تینوں جلدیں ۴۲ پونڈ میں خریدی تھیں[۱]۔

اودھ اخبار نے 'ہفت روز' نامی مثنوی کا اشتہار چھاپا ہے[۲]۔ در اصل اس کا نام 'ہفت بند' (بند) ہونا چاہیے تھا کیوں کہ مثنوی سات حصّوں میں تقسیم ہے اور ہر ایک کا عنوان 'بند' ہے۔ یہ ایک ہونہار شاعر گنج پورہ کے رئیس نواب غلام احمد کا کارنامہ ہے جن کی اخبار نویس نے بڑی تعریف کی ہے۔ انھوں نے شاہزادۂ ویلز کے اعزاز میں یہ مثنوی لکھی تھی اور انھی کے نام معنون کی ہے۔ پہلی بند کاہلی کے خلاف ہے اور مثال کے طور پر ہمایوں کی داستان بیان کی ہے۔ دوسرے میں بُروں کی صحبت کی مذمت ہے اور قطب الدین کی ایک حکایت نظم ہے۔ تیسری بند میں دور اندیشی کی تلقین ہے اور نیپولین اعظم کا عبرت ناک قصّہ ہے۔ چوتھا باب انصاف کی مدح میں ہے اور اس کے متعلق غیاث الدین بلبن کا نظریہ بیان کیا ہے۔ پانچویں بند میں بادشاہوں کو اعلا ظرفی کی نصیحت کی ہے اور بابر کی مثال دی ہے۔ اس کے بعد حاکم کو رعایا کی محبّت کی طرف راغب کرتے ہوئے یونان کے ایک خداترس بادشاہ کا حال سنایا ہے۔ آخری بند جو گویا رعایا کی خوش حالی کا ترانہ ہے۔ ملکۂ معظمہ کی مدح پر ختم ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ یہ نظم صرف زبان و بیان ... کے لحاظ سے

---

[۱] Catalogue of Bernard Quaritch

[۲] ۲۲ اپریل ۱۸۷۶ء

موثر نہیں۔ بلکہ یہ تاریخی واقعات کا مرقع بھی ہو جس میں حکمت کی چاشنی گھلی ہوئی ہو۔

ہندی کے مشہور مصنف بابو ہرش چندر نے "من مکھ مالا" کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ 'قیصر ہند' کی ستایش میں شایع کیا ہو۔ اس میں اُردو کی ایک غزل بھی شامل ہو جس میں بابو صاحب نے 'رسا' تخلص اختیار کیا ہو۔

مسٹر Eastwick ایسٹ وک بھی اسی قسم کا مجموعہ چھاپنے کے فکر میں ہیں۔ اس کا نام 'قیصر نامۂ ہند' ہوگا۔ اس میں دلّی دربار کی تفصیل کے علاوہ اس میں شامل ہونے والے رؤسا کے حالات ان کے شجروں کے ساتھ درج ہوں گے۔

نئی مطبوعات میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔

بھاگوت پران کا مکمل ترجمہ، از پنڈت پیارے لال۔

تذکرۃ الخلفا منظوم۔ حکیم امانت علی رئیس سہارن پور نے عربی تاریخوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہو۔

اصولِ اخلاق و قوانین: اب تک اُردو میں اس قسم کا رسالہ نہ تھا۔ [illegible]ء میں میرے دوست مسٹر Boutros بوتروس نے جو دلّی کالج کے پرنسپل تھے، انگریزی میں، یہ کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ پنڈت رام کشن نے اُردو میں کیا تھا۔ یہ گئی گزری بات ہوئی کیوں کہ وہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی۔ بھلا ہو دیال سنگھ امرت سری کا کہ نظرِ ثانی کے بعد اسے وکیلِ ہندستان کے چھاپے خانے سے دوبارہ شایع کیا۔ اس میں آئین کے اصول اور دیوانی و فوجداری کے قوانین سلجھا کر لکھے گئے ہیں۔ یہ [illegible]

امتحانوں میں تو کام آئے گی ہی، ساتھ ساتھ ان ہندستانیوں کے لیے بہت مفید ہوگی جو انگریزی نہیں جانتے۔ پادری رجب علی مہتمم چھاپہ خانۂ وکیل ہندستان نے کتاب کا اشتہار دیا ہے۔

قانون ورسوم عدالت ہائے ہند: سات سال بعد یہ کتاب دوبارہ چھپی ہے۔ اس میں نئے قوانین بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ حکومتِ پنجاب کے مترجم اعلا محمد لطیف صاحب نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ کتاب کا حجم پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت دُگنا ہے۔

احسن التواریخ: یہ دراصل صوبۂ اودھ کی تاریخ ہے۔

اُردو اخباروں نے اعلان کیا ہے کہ میرزا دبیر کے مرثیوں کا مجموعہ دو جلدوں میں لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔ اسی طرح میر انیس کے مرثیے بھی دو جلدوں میں جمع کر دیے گئے ہیں[1]۔

مولوی نصرت علی دہلوی نے اپنی تصنیف 'سرابِ عالمِ اسباب' کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے۔ ان کی اس کتاب کی سارے ملک میں شہرت ہوتی ہے۔ 'مفیدِ عام' کے نام سے ہندستان سے جو واحد عربی اخبار نکلتا ہے، موصوف اس کے ایڈیٹر اور دلّی کے نامی پریس 'نصرت المطابع' کے مالک ہیں۔ یہ کتاب بارہ ابواب میں منقسم کی گئی ہے اور ہر ایک میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث ہے۔ مثلاً بہادری، فیاضی، سمجھ داری، مروّت وغیرہ۔ ہر باب میں حکایتوں اور روایتوں کی رنگ آمیزی ہے۔ اسے ایک قسم کا پندنامہ سمجھنا چاہیے۔

اسی سال اودھ اخبار کے چھاپے خانے سے 'لطائف اللغات'

---

[1] اودھ اخبار ۱۵ جنوری ۱۸۷۰ء

نامی ڈکشنری شایع ہوئی۔ مثنوی مولانا رومؒ کے الفاظ اور محاورے اس لغت میں یک جا کر دیے گئے ہیں[1]۔ یہ مولوی عبداللطیف کی محنت کا نتیجہ ہی۔ ان کے والد مولوی کبیر صوبۂ گجرات کے نامی گرامی عالم ہیں اور اسی مثنوی پر ان کی شرح مستند سمجھی جاتی ہی۔

یہ اطلاع آپ کے لیے مسرت بخش ہوگی کہ ڈاکٹر فیلن کی ہندستانی انگریزی ڈکشنری کی طباعت کا سلسلہ جاری ہی۔ اس کا گیارھواں حصّہ ابھی حال ہی میں چھپ کر نکل آیا ہی۔ سب ملاکر ۲۵ حصّے ہوں گے۔ ملک بھر کے اخباروں نے بہ یک زبان اس کارنامے کی تعریف کی ہی۔ اودھ اخبار نے تو پانچ کالم کا ایک طویل اور سنجیدہ تبصرہ شایع کیا ہی۔

<u>گنج الدقائق</u>: اس میں حنفی مذہب کے اصول ۳۵ ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔ عبداللہ بن محمود کے زورِ قلم کا نتیجہ اور اودھ اخبار پریس سے چھپا ہی۔

<u>دیوانِ ضامن</u>: سید ضامن علی کی غزلوں کی بیاض ہی۔

علی گڑھ اخبار نے لکھا ہی[2] کہ بوستانِ خیال کی چوتھی جلد شایع ہوگئی ہی۔ پنجابی کا بیان ہی کہ اس داستان کی پانچویں جلد کا ترجمہ تیار ہوچکا ہی۔ اس کے بعد کی دو جلدیں بھی عنقریب اشاعت پزیر ہوں گی۔

شرح قانونِ شہادت: سید احمد خاں کے لائق فرزند سید محمود کی تصنیف ہی۔ مصنفوں اور وکیلوں کے لیے یک ساں مفید ہی۔ گو مضمون دقیق تھا لیکن مصنف نے اسے بہت سلجھا کر بیان کیا ہی۔

---

[1] اودھ اخبار ۲۰ اپریل ۱۸۸۲ء [2] ۱۱ مئی ۱۸۸۲ء

<u>صولت افغانی</u>: حاجی محمد زردار خاں کی لکھی ہوئی افغانوں کی تاریخ ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک کا حال ہے۔ افغانستان کے بادشاہوں اور قبیلوں کے حالات ان کے حسب و نسب کے ساتھ جمع کیے ہیں اور افغانیوں کی روایتی بہادری اور فیاضی کے نمونے بھی دیے ہیں۔ علی گڑھ اخبار نے لکھا ہے[1] کہ اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ ایسے چھوٹے سے ملک نے کیسے کیسے جاں باز اور پہنچے ہوئے بزرگ پیدا کیے ہیں۔" حجم چھ سو صفحات ہے اور زبان بہت صاف ہے۔ کتاب اودھ اخبار کے چھاپے خانے میں طبع ہوئی ہے۔ اب تک افغانستان کی ایسی جامع تاریخ شایع نہ ہوئی تھی۔

'پنجابی' نے دو کتابچوں پر ایک طویل تنقید لکھی ہے۔ یہ حافظ عمر دراز فیض کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک کا نام فیض المعنی اور دوسرے کا فیض البیان ہے۔ دونوں انشا پردازی سے متعلق ہیں اور تنقید نگار کی رائے میں ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

<u>تنزیہ الفرقان</u>: اس میں آگرہ کے سید محمد عباس نے پادری عماد الدین کی کتاب 'ہدایۃ المسلمین' کا جواب دیا ہے۔ فاضل پادری کا دعوا ہے کہ قرآن میں الخیر زبان و بیان کی سیکڑوں غلطیاں نظر آتیں۔ ان کی فہرست دے کر انھوں نے مسلمان عالموں کو چیلنج دیا تھا کہ ایامِ جہالت کے ادب سے اپنے حق میں ثبوت پیش کریں۔ عماد الدین نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ کئی آیتوں میں تضاد اور تکرار کا عیب ہے اور کئی بے معنی ہیں۔ پیشِ نظر کتاب کا ایک نسخہ مصنف نے مجھے عنایت فرمایا ہے۔ اس میں محمد عباس صاحب نے بڑی محنت سے ایامِ جہالت

---

[1] ۱۰ نومبر ۶۷ء

کے شعرا کے کلام سے نو عیسائی عالم کی تردید میں اسناد جمع کیے ہیں۔ انھوں نے فرداً فرداً ہر اعتراض کا جواب دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی عرق ریزی کی ہے۔ سید احمد خاں نے کئی سال پہلے انگریزی زبان میں پیغمبرِ اسلام کے حالات تحریر کیے تھے۔ اب اس کا ترجمہ اردو میں خطباتِ احمدیہ کے نام سے چھپ رہا ہے۔[1]

میرا خیال ہے کہ یہ سر ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا جواب ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور اس کا نیا ایڈیشن نکلنے والا ہے۔ سید احمد خاں کا بیان ہے کہ سر ولیم کے تمام ماخذ غیر مستند ہیں۔

سائنس پر اس سال کوئی اہم کتاب دیکھنے میں نہ آئی (Todhunter) ٹاڈھنٹر کی کتاب 'حرکیات و سکونیات' کا ترجمہ پنڈت کرپا رام نے کیا ہے۔ ڈاکٹر چِنتین شاہ نے 'آئینۂ سوزاک' کے نام سے ایک طبی رسالہ لکھا ہے جس کی اخبار پنجابی نے تعریف کی ہے۔ 'نوین پنچانگ' نامی جنتری بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ مغربی اصولوں پر مرتب کی گئی ہے۔ اس کے مصنف بلونت راؤ ونایک شاستری ہیں جن کے بڑے بھائی نے یہ سلسلہ شروع کر کے ہندوؤں کے علمِ ہیئت میں کایا پلٹ کر دی تھی۔

اب میں ہندستان کی چیدہ چیدہ نئی مطبوعات کے نام گناتا ہوں:

(الف) صوبہ جات شمال و مغرب کی مطبوعات:

بہشت: نعتِ رسولؐ از مولوی احمد حسین بریلوی۔

مخزنِ محبت: عرف مہابھارت ـــ سنسکرت اور اردو میں از جوالا پرشاد اکبرآبادی۔ یہ کئی جلدوں میں ختم ہوگی۔ پیشِ نظر جلد میں

[1] علی گڑھ اخبار ۲ ستمبر [illegible]

۱۶۰ صفحات ہیں۔ مصنف نے ہندی میں بھی یہ سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔

سوال و جواب علم طبیعی العلوم: طبیعات پر از ترنی چرن بہادری غازی پور۔

شارنگدھر تیکا سہت: سنسکرت اور ہندی میں طب پر ایک کتاب جو میرٹھ سے شایع ہوئی ہے۔ کوئی تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

اندر جال: ہندی اور سنسکرت میں۔ طبع شدہ میرٹھ۔ حجم ۴۰ صفحات۔

بھگوت گیتا مع شرح: بنارس میں چھپی ہے۔

آکھیان منجری: کہانیوں کا مجموعہ۔ از رام پرشاد جی۔

گلزار چمن: مثنوی از سیتا پرشاد۔ میرٹھ سے شایع ہوئی۔

سنگیت بینا سو بیرکا: پنڈت ہر دیو سہاے کے زورِ فکر کا نتیجہ ہے۔

استری دھرم سنگرہ: پنڈت تارا چند بریلوی نے وہ قوانین یک جا کر دیے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہیں۔

شبد ارتھ دیپکا: ہندی کی ڈکشنری جو گوبردھن پرشاد نے لکھی ہے۔

ذکرِ شاہِ انبیا: نعتِ رسولؐ از منشی امیر احمد۔ طبع شدہ رام پور۔

تزکِ قیصری عرف تاریخ دربارِ دلّی: از منشی گوکل پرشاد۔ کان پور میں چھپی ہے۔

(ب) مطبوعات لکھنؤ و اودھ

سرورِ غیبی: اُردو و فارسی قطعات کا مجموعہ۔

بھجناولی: جگن ناتھ سہاے کے ہندی بھجنوں کا مجموعہ۔

سُکھ ساگر: بھاگوت پران کا ہندی ترجمہ از ماکھن لال۔ حجم ۹۶۲ صفحات

سنگار تیپی: کشن جی کی رنگ رلیوں کی کہانی۔

امرت ساگر: طبی رسالہ از پنڈت کالی چرن۔ حجم ۵۴۶ صفحات۔
گل دستۂ ادب: آداب مجلس کا تذکرہ۔ از منشی دیوی پرشاد۔
کلیات نظام: از مردان علی رانا۔ حجم ۴۴۳ صفحات۔
کشن ساگر: کشن جی کا احوال۔ از پنڈت جگن ناتھ۔ حجم ۶۵۲ صفحات۔
کالیستھ ورنن: کالیستھوں کی تاریخ۔ از کالی پرشاد۔
ہندو دھرم شاستر: از کالی پرشاد۔ حجم ۲۳۶ صفحات۔
بھگوت گیتا: از ہربنس لال۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔
آئینۂ ناظرین: فضل احمد کیف کا دیوان۔
مکتوب احمدی: خط شکستہ کے نمونے۔ از منشی احمد حسین۔

طلسم عبرت آتش عشق فغان عیش	فدا علی عیش کی لکھی ہوئی تین عشقیہ نظمیں۔

تنبیہ الخوارج: احمد علی شاہ کا لکھا ہوا مذہبی رسالہ
ضوابط عدالت: از منشی گلاب رائے۔
مجموعۂ امتحان قوانین ہندستان: سوال جواب کی صورت میں۔
طلسم بمبئی: از نوروجی۔ بمبئی کا حال ہے۔
گلشن زراعت: از جواد علی۔
فغان نطق: عشقیہ نظم از نطق
سوریہ پران: ہندی میں ایک مذہبی دعا۔
مرآۃ دانش: اردو رومان۔ از آغا حسن۔ بلرام پور میں چھپا ہے۔
وصایائے مہاراج کمار: کنور جگت سنگھ کے حالات

جوتک چندرکا: جوتش پر ہندی رسالہ۔ از شمبھوناتھ

دیوی بھاگوت: از پنڈت مہیش دت۔ تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے

گنجینۂ سروری: ایک قسم کی تاریخی ڈکشنری ہے جس میں آں حضرتؐ سے لے کر تا ایں دم تمام مشہور اسلامی اکابر کی ولادت اور موت کی تاریخیں ہیں۔ از منشی غلام سرور۔

گل دستۂ فیض: غزلوں کا مجموعہ۔ حجم ۲۰۳ صفحات۔

کلیاتِ تراب: از تراب علی شاہ۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔

رام ولاس: والمیک کی راماین کا ہندی ترجمہ از رام پرشاد۔

چشمۂ شیریں: اُردو رومان۔

انشائے بہارِ بے خزاں: از غلام امام شہید۔

مانس کامان: تصوّف کی شاعری کا نمونہ۔ منشی کنھیا لال کا لکھا ہوا ہے۔

رفعِ وہمیات: ہندوؤں کے اوہام کی تردید۔ از منشی چمن لال۔

مجلس الاولیا: معرکۂ کربلا کی تاریخ۔ از میر سید علی۔ حجم ۵۶۲ صفحات۔

سیف الجبار: وہابیوں کی تردید میں یہ کتاب فضل رسول صاحب نے لکھی ہے۔

طبِ عزیزی: طبِ اکبر کا اُردو ترجمہ از عبدالعزیز۔ حجم ۲۷۶ صفحات۔

ذخیرۂ سعادت: بچّوں کی تربیت کے اصول جو جلیلی صاحب نے مرتب کیے ہیں۔

دیوانِ جرّار: جرّار کا کلام

دیوانِ امیر: ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

گیتا مہاتمیہ: اُردو میں بھگوت گیتا کی شرح۔ از لالہ جی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (ށ)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرقعِ سلاطین: از عبدالغفور۔ یہ پانڈووں سے لے کر ملکہ وکٹوریہ تک کے بادشاہوں کی فہرست ہے۔

دہ مجلس وچہل مجلس: عطاء اللہ خاں کے مرثیوں کا مجموعہ۔ طبع شدہ دلی۔

مہندرساگر: مہاراجا پٹیالہ کی تعریف میں سنسکرت میں ایک قصیدہ لکھا گیا تھا۔ اُردو میں یہ اس کا ترجمہ ہے۔

عقوبت الظالم: از محمد ابوالمنصور علی (دہلی) تردید ہدایت الاسلام تصنیف پادری عماد الدین۔

حجت الاسلام: ایک مذہبی کتاب جو لاہور سے شایع ہوئی ہے۔ تالیف پادری ایف۔ اے۔ پی یشریف

واک سُدھاکر: ویدانت کی کتابوں کے منتخب جملوں کا ہندی میں انتخاب از سادھورام لاہوری۔ حجم ۲۸۶ صفحات۔

بارہ ماسا: عطا بخش کی لکھی ہوئی نظم۔ عشقیہ انداز میں ہر مہینے کا بیان۔ ہر موسم میں کوئی عورت محبوب کی جدائی کا رونا رو رہی ہے۔

دروٗلیلا: ہندی نظم از عطا بخش۔ سادھو دروٗ کے حالات۔

دھرم پرچار کی چھٹویں پُستک: ہندو مذہب کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ۔ از بہاری لال۔

ٹوپی [illegible] کا کشن: از [illegible]

کبریت الاحمر و دعائے مغنی: بابو کیشو چندر سین کے ایک خطبے کا اُردو ترجمہ۔

جواہر خمسہ: شاہ محمد غوث کی دعاؤں کا مجموعہ۔ طبع شدہ دلی۔

الکھ پرکاش: اُردو میں اُپنشد کا ترجمہ۔ از منشی کنہیا لال۔ حجم ۸۰ صفحات

ست دھرم پیڑیکا: ہندی بھجن۔ لاہور

پوتھی شری بھاگوت: بھاگوت کے بعض حصّوں کا ہندی ترجمہ۔ از رلّا داس۔

عمدۃ البیان: شیعہ نقطۂ نگاہ سے قرآن کریم کی شرح۔ از منشی سیّد امیر علی۔ طبع شدہ لاہور۔ حجم ۲۰۸ صفحات۔

اندر سبھا: اس مشہور راو پیرا کا یہ نیا ایڈیشن ہی۔

بیربل نامہ: راجا بیربل کے لطیفوں اور چٹکلوں کا مجموعہ۔ از جہانارائن دہلوی۔

بوجھ پہیلی: امیر خسرو کی پہیلیوں کا مجموعہ۔

تحفۂ دل پذیر: لطیفوں کا انتخاب۔ از بلاقی داس دہلوی۔

انتخاب ظفر: آخری مغل تاج دار کے کلام کا انتخاب۔

تاریخ مکہ: از میر عباس دہلوی۔

مثنوی ولی رام: ایک مسلمان بزرگ ولی رام نے اس میں صوفی عقائد کی تشریح کی ہی۔

پرہلا د سنگیت: زمانۂ قدیم کے ہندو بھگت کی زندگی کے حالات از لچھمن۔

واسوخت نامہ: از امانت لکھنوی۔

غمزۂ دل ربا: دراصل یہ ایک ہندو بزرگ کا سفرنامہ ہی جسے امبا پرشاد سیال کوٹی نے ترتیب دیا ہی۔

اعتقاد الاسلام فی رد برہان مسلم: وہابی عقائد کا جواب۔ پشاور حجم ۲۰۲ صفحات۔

رسالۂ اصول برہمو دھرم: برہمو سماج کے عقائد سرسری طور پر

بیان کیے گئے ہیں۔

راحتِ حقیقی: از سردار دیال سنگھ۔ لاہور میں برہمو سماج کی بارھویں سال گرہ کے موقع پر یہ خطبہ پڑھا گیا تھا۔

شوا پران: سیال کوٹ سے چھپا ہے۔ پونے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

چشمۂ فیض ہر دل عزیز: منشی کنھیا لال سیال کوٹی کے فلسفیانہ خیالات کا نمونہ ہے۔

مضمون لالہ لچھمی نارائن: وہابیوں کے عقیدے پر خیال آرائی ہے۔

الکھ امواج: یوگ واشِشٹھ کا ترجمہ۔ از منشی کنھیا لال سیال کوٹی۔

ذخیرۂ رفاہِ عام: در اخلاق۔ سیال کوٹ۔

وگیان سدھا: ویدانت پر ایک رسالہ جسے و گ۔ موہن لال نے تحریر کیا ہے۔

گیان دیپک: مذہبی رسالہ برج باسی لال کا لکھا ہوا۔

ترجمہ مجموعۂ شری مہما: یہ بھی ہندو مذہب سے متعلق ہے۔ منشی دیوان چند نے لکھا ہے۔

جنگ بہادری: سید عین حسن نے مذہبی معاملات پر رائے زنی کی ہے۔

حسبِ بالا سات کتابیں سیال کوٹ سے شایع ہوئی ہیں۔

(ت) کلکتہ و بنگال کی جدید ہندستانی مطبوعات:

جین یوجاولی: جین مذہب پر ہندی میں ایک کتاب جو عظیم گنج سے شایع ہوئی ہے

قصۂ مرگاوتی: منظوم اُردو رومان۔

ودیا نیو: بنگالی کتاب کا ترجمہ۔

شجرۃ ا...ء فی جنت النعیم: از شاہ غلام نجف (اُردو میں)۔ آرہ

کتاب الجنت: اس کی تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔

قولِ ثابت: از مولانا کرامت علی۔ حجم ۳۴۴ صفحات۔

اپنشد پترکا: از نوین چندر راج۔ روح کی عظمت پر اپنشد کے ۸۴ اشلوکوں کا ہندی میں ترجمہ بمع شرح۔

تاج الاقبال عرف تاریخ ریاست بھوپال: بھوپال کے نواب صدیق علی خاں نے یہ کتاب بنگال ایشیا ٹک سوسائٹی کو دے دی ہے۔

مرآۃ الملوک: از رحیم بخش۔

نجات نامہ: بنگالی اُردو میں اشعار کا مجموعہ۔

(ث) بمبئی کی جدید ہندستانی مطبوعات

مقاصد الصالحین: اخلاق پر ایک کتابچہ۔

پنچادشی: فلسفہ ویدانت پر سنسکرت اشلوک مع ہندی ترجمہ و شرح۔

تفسیر رؤفی: شرح قرآن از عبد الرؤف۔ حجم ۶۷۰ صفحات۔

قصۂ شاہ زکوم: منظوم قصہ۔ از عبد الرسول۔

شاہ جہاں، شاہ پری اور روشن جلال: یہ ڈراما ایک انگریز کا لکھا ہوا ہے۔ حجم ۲۵ صفحات۔

سدا بدھ سالنگیا کا خیال: سدا بدھ سالنگیا کے گیت۔

ویدامنی دھوانتا نوارنم: ویدانت کی غلطیوں کی تردید۔

مولوی سید ...ت علی قیصر کی تصانیف

مرآۃ الصالحین:

[illegible]

[illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] :

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] :

[illegible] : [illegible]

[illegible] :

[illegible] : [illegible]

[illegible] : [illegible]

[illegible] [illegible]

تذکرۂ رسولِ اکبر: حکیم امانت علی کی لکھی ہوئی نعت۔

طلسمِ عجائب: اس میں تعویذوں کی عبارت اور اشکال درج ہیں۔

دیوانِ ہوشیار: از منشی کیول رام بجنوری۔

پوتھی سیتا سوئمبر: ضلع مونگیر کے بابو گردھر نارائن کی لکھی ہوئی ہندی نظم تصویروں کے ساتھ۔

رام ابھشیک ناٹک منظوم ڈراما از بابو رام گوپال۔ رام چندر جی کے حالات سے متعلق ہے۔

برہمو سماج: اس اُردو رسالے میں سماج کے عقائد سمجھا کر بیان کیے گئے ہیں۔

رام ابشک ناٹک: از رام گوپال

ہندستانی اخباروں میں جو نظمیں شایع ہوا کرتی تھیں ان میں سے ایک مثنوی جو پنجابی میں چھپی ہے[1] بہت دل چسپ ہے۔ یہ مولوی باقر حسین متعلم اینگلو عربک کالج دلّی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں مسلمانوں کو اپنے مذہب کی سختی سے پابندی کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور بیواؤں کے معاملے میں کافروں کی پیروی کو ترک کرنے کی تلقین ہے۔ ایک شاعرہ کی غزلیں بھی داد طلب ہیں۔ ان کا نام نواب صدر محل ہے اور پادشاہ نامہ و گل دستہ کے نام سے ان کے کلام کے انتخاب منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

یادش بخیر بمبئی کے نامی شاعر نواب نبی بخش خاں بہادر دلاور جنگ کی عمر اب سو سال ہوئی۔ غدر کے زمانے میں یہ انگریزوں کے ساتھ تھے

[1] ۱۱ نومبر سنہ ۶۰ء

[illegible]

سوال یہ ہے کہ انگریزی، لاطینی یا یونانی کی اصطلاحات کو جوں کا توں ہندستانی زبانوں میں داخل کر دیا جائے یا ان کے ہم معنی سنسکرت الفاظ کا استعمال کیا جائے؟ یا مشہور عالم راجیندر لال مترا کی اس صائب رائے[1] پر عمل کیا جائے کہ عام فہم ملکی اصطلاحات وضع کی جائیں اور غیر ملکی الفاظ صرف اس صورت میں لیے جائیں جب وہ قطعاً ناگزیر ہوں۔ یورپین زبانوں سے اسی آخری اصول پر عمل کیا جائے۔

مجھے 'حساب الاطفال' نامی فارسی اردو لغت کا ایک نسخہ موصول ہوا ہے۔ یہ لغت منشی وزیر سنگھ دہلوی المتخلص راقم نے نظم میں لکھی ہے اور دلی کے اردو پریس سے اسی سال شایع کی ہے۔

سنا ہے کہ رنگون میں انگریزی، برمی، ہندستانی اور تامل کی ایک مجموعی لغت تیار ہو رہی ہے جو یقیناً نہایت مفید ثابت ہوگی۔

(۳)

پچھلے سال ہندستان میں جتنے اخبار شایع ہوئے تھے، ان کا گوشوارہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:[2]

بنگال: ۶۳ انگریزی ۹۰ دیسی اور ۱۲ نیم انگریزی نیم دیسی

بمبئی: ۳۴ انگریزی ۸۱ دیسی اور ۹۰ نیم انگریزی نیم دیسی

مدراس: ۳۸ انگریزی ۳۲ دیسی اور ۳۴ نیم انگریزی نیم دیسی

صوبہ جات شمال و مغرب: ۱۶ انگریزی ۵۸ دیسی اور ۸ نیم انگریزی [illegible] دیسی

[1] A Scheme for the rendering of European Scientific terms in the vernacular of India. Cal. 1877

[2] Indian Mail ۲۱ مارچ

پنجاب: ۳۱ انگریزی، ۴۶ دیسی اور ۲ نیم انگریزی نیم دیسی
برطانوی برما: ۱۴ انگریزی ۷ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
سندھ: ۹ انگریزی ۳ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
اودھ: ۸ انگریزی ۲۰ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
راج پوتانہ: ۱ انگریزی ۴ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی
آسام: ۱ انگریزی ۷ دیسی اور ۱ نیم انگریزی نیم دیسی

بعض نئے ہندستانی اخباروں کے نام چھوٹ گئے تھے جنھیں میں اب درج کرتا ہوں:

ادیب عا: اودھ اخبار نے اس کا ذکر کیا ہے۔

اخبار انجمن لکھنؤ:

اختر ہند: بھوپال سے نکلتا ہے۔

انوار الاخبار: لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے۔

اتالیق زمین داران: مہینے میں دوبار نکلتا ہے اور زمین داروں کو ان کے مطلب کی معلومات پہنچاتا ہے۔

گوجرانوالہ:

ہادیِ حقیقت: لاہور کے برہمو سماج کا آرگن جو اُردو اور ہندی میں چھپتا ہے۔

لمع النور: جون پور سے شایع ہوتا ہے۔

... الاخبار: گوڑگانو سے نکلتا ہے۔

محکمۂ ...: پشاور سے شایع ہوتا ہے۔

آئنۃ الارض: مدراس کا اُردو جریدہ۔

مرشد آباد ویتز کا : ہندی میں شایع ہوتا ہی۔

مشیرِ قیصرِ ہند: بنارس سے نکلا ہی۔

نادرالاخبار: اسے مونگیر کے برمھو سماجی تین سال سے نکال رہے ہیں۔

نورالہدا : قصبۂ قصور کا ماہانہ رسالہ۔

پنجاب ریویو: اشتہار میں کہا ہی کہ پہلے پادری رجب علی اس کی ادارت کرتے تھے۔

رفاہِ عام: سیال کوٹ سے شایع ہوتا ہی۔

سفیرِ ہند: دلی کا جریدہ۔

سفیرِ ہندستان: امرت سر سے نکلتا ہی اور پادری رجب علی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ سنتے ہیں کہ وکیلِ ہندستان اب اس نام سے نکلنے لگا ہی۔

سیدالاخبار: لاہور، دلی اور مدراس سے اسی نام کے مختلف اخبار نکل رہے ہیں۔

سفیرِ مدراس:

شفاءالصدور: پنجاب یونی ورسٹی کے پروفیسر عبدالحکیم اس کے مدیر تھے۔ ان کے ایک مضمون پر اعتراض ہوا جس کی وجہ سے انھیں ادارت کے فرائض سے سبک دوش ہونا پڑا۔

وِدیا دلاس: جموں کا ہندی اخبار

بمبئی سے ایک ہندستانی رسالے کے اجرا کی خبر ہی جس میں انگریزی ادب کے شاہ کاروں کے تراجم شایع ہوا کریں گے۔ یہ اپنے ڈھنگ کا انوکھا رسالہ ہوگا اور اس کے ذریعے انگریزی ادب ہندستانیوں تک پہنچ سکے گا۔

یہ بھی سنا ہو کہ ہوشیارپور سے زراعت پر ایک رسالہ نکلنے والا ہو۔

نورالہدیٰ نامی اخبار کا میں نے نام لیا ہو یہ اسلام کی اشاعت کے لیے وقف ہو اور اسے غلام اللہ صدیقی نکالتے ہیں۔ یہ تین حصّوں میں تقسیم ہوتا ہو جس میں سے ایک علم الکلام، دوسرا ارکانِ مذہب اور تیسرا تاریخِ اسلام کے لیے مخصوص ہو۔

رام پور کا تاج الاخبار خریداروں کی قلت کی وجہ سے بند ہوگیا۔

بنارس کے ہندی رسالے "کاشی پترکا" ایک نمبر نظر سے گزرا۔ یہ مہینے میں دو بار نکلتا ہو اور سائنس و ادب کے پُراز معلومات مضامین شایع کرتا ہو۔ اس کا نصف حصّہ اُردو میں ہوتا ہو۔

اودھ اخبار کے مینجر نے ۲۷ اپریل کے پرچے میں اشتہار دیا ہو کہ ایک قابل ایڈیٹر کی ضرورت ہو جو اُردو کا انشا پرداز ہونے کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی سے اچھی طرح سے واقف ہو۔ پنجابی کے حسبِ ذیل مضمون سے اس اشتہار کا منشا معلوم ہوگا: "یہ سچ ہو کہ ہمارے ملک میں اخباروں کی کمی نہیں۔ لیکن جو یہ جانتے ہیں کہ یورپ کی ترقی اور خوش حالی میں انگریزوں کا کتنا ہاتھ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندستان کی وسیع سرزمین کے لیے دو چار ہزار اخبار بھی ناکافی ہوں گے۔ اس صورت میں سو دو سو اخباروں کی بھلا کیا حقیقت ہو اور جب کہ ان میں بھی بہت سے برائے نام زندہ ہیں۔ اس پر طرفہ یہ ہو کہ ایسے جریدے خال خال ہیں جو اپنی خوش ترتیبی اور آزاد خیالی کی وجہ سے ممتاز ہوں۔ بااثر اخبار حکومت کا مشیرِ خاص ہوتا ہو۔ وہ جو کام کر سکتا ہو کسی وزیر با تدبیر سے بھی نہیں ہو سکتا۔ رعایا کے لیے تو

اخبار حاکم و رعایا کا مشیر ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے اخبار کا نام "مشیرِ قیصرِ ہند" رکھا ہے"۔

بعد ازاں مضمون نگار نے مجوزہ اخبار کی ترتیب کا خاکہ دیا ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ حکومت کے افعال پر راے زنی کی جائے اور اہلِ ہند کے جائز حقوق کی تائید کی جائے، انگریزی اخباروں کی غلط بیانی کی تردید کی جائے گی اور ملک کی بہبودی کے لیے تعمیری پروگرام سمجھایا جائے گا۔ نئی کتابوں پر بے لاگ تبصرہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ کہ عربی، فارسی، انگریزی و دیگر زبانوں کے جریدوں سے خاص مضامین کے ترجمے کیے جائیں گے۔

اب میں علی گڑھ اخبار کا ایک دل چسپ مضمون درج کرتا ہوں جس میں حکومت اور ہندستانی اخباروں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے: "لارڈ نارتھ بروک کے وزیرِ حکومت میں کونسل کے کچھ ارکان کو سوجھی کہ ملکی اخباروں پر پابندی عائد کی جائے۔ اس سے اندیشہ ہوا کہ حکومت پریس کو آزادی سے محروم کرنا چاہتی ہے۔[1] اس سلسلے میں ہمیں یہ کہنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ہم اب تک 'آزادی' کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ آزادی کا مطلب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کو بھلا برا کہنے کا حق ہے اور وہ بلا خوف اسے کھوٹی کھری سنا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کی آزادی خطرناک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت اور اس کے

[1] یہ تجویز صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس طرف بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے ایک دربار میں اشارہ بھی کیا ہے۔ حکومت کو بنگال کے اخباروں سے خاص طور پر شکایت ہے۔

کارندوں پر تنقید کرنے کی آزادی اخباروں کو ہونی چاہیے۔ یہ حکومت اور رعایا دونوں کے لیے یکساں مفید ہو اور حکومت کو اس قسم کی آزاد خیالی سے خوش ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی بھی ایک حد مقرر ہو اور اس سے تجاوز کرنا مناسب نہیں۔ ممکن ہو کہ ہمارے کئی معاصر اس معاملے میں ہم سے متفق نہ ہوں لیکن ہم خلوص سے اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پریس کی آزادی کی ایک حد تسلیم کر لینی چاہیے۔ خدا لگتی تو یہ ہو کہ حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے سخت درشتی سے کام لیا جاتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے حاکموں نے ہندستانیوں پر مظالم کیے ہیں۔ لیکن اس کا الزام ساری حکومت پر رکھنا مناسب نہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ موجودہ حکومت سے ملک کی قسمت وابستہ ہو چکی ہو۔ کئی اخبار حکومتِ وقت کو ایسی سختی سے بھلا برا کہتے ہیں گویا اس سے امن و انصاف کی توقع نہیں رکھتے۔ بہ ایں ہمہ یہ ماننا پڑتا ہو کہ یہ اخبار بدنیت نہیں وہ صرف مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ یہ بھی ہو کہ ناظرین کو خوش کرنے کے لیے وہ ذرا بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ضبط سے کام نہ لیں گے تو حکومت ان کے مشورے پر کیوں توجہ کرنے لگی؟ اس گرم گفتاری سے ملک کا نقصان ہوتا ہو۔ بہرحال حکومت کو ساری اخباری برادری سے برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ آزادی رعایا کی ترقی کے لیے ضروری ہو لیکن اس سے پہلے اس کے صحیح استعمال کی تعلیم ملنی چاہیے۔ ہمیں اپنے کو اس نعمتِ عظمیٰ کا اہل ثابت کرنا ہو۔

اب یہ دیکھنا ہو کہ کیا انگریزی اخباروں سے ہم زبان ہو کر حکومت

کو ہماری آزادی چھین لینی چاہیے۔ کیا یہ بھی ایک قسم کی انتہا پسندی نہیں ہی اور اس سے فائدے کی بجائے نقصان نہ ہوگا؟ اس وقت حکومت کو اخباروں کے توسط سے رعایا کی خوشی یا خفگی کا علم ہوتا ہی اور انتظامی امور پر ان کی رائے معلوم ہوتی رہتی ہی۔ یہی ایک واحد وسیلہ ہی جن کے ذریعے رعایا کے دل کا حال عیاں ہوتا رہتا ہی۔ جب اخبار نہ نکلتے تھے تو حکومت کی پوزیشن پر جھوٹی سچی افواہوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا کیوں کہ لوگ لاعلمی کے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن اب لوگ اخبار بینی کے عادی ہو چکے ہیں اور حالت بدل گئی ہی۔ اب اخباروں کے بند ہونے سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوں گے اور حکومت کی نیت کے متعلق انھیں شبہہ ہوگا۔ لہٰذا ہم بھی اخبار پانیر کی اس رائے کے حق میں ہیں کہ اگرچہ فی الجملہ ہندستانی اخبار پسندیدہ نہ بھی سہی تاہم انھیں بند کرنے سے سخت نقصان ہوگا۔

یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اخبار برابر ترقی کر رہے ہیں۔ پانچ سال پہلے اور آج کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہی۔ حکومت پر نکتہ چینی کرتے کرتے عوام میں سیاست اور آئین کا چرچا ہونے لگا ہی۔ جیسے جیسے عوام کا مطمحِ نظر بلند ہوتا جائے گا، خود بہ خود اخباروں کی بھی اصلاح ہوتی جائے گی"۔

اودھ اخبار[1] نے بھی تقریباً یہی باتیں لکھی ہیں۔ اس نے یہ یہ ایک سچے کی بات لکھی ہو کہ ہندستان میں کوئی پارلیمنٹ نہیں ہی جو

---

[1] ۱۴ اپریل [illegible]

حکومت کے افعال کا جائزہ لے اور رعایا کی ضروریات سے اسے باخبر رکھے۔ اس صورت میں اخباروں کی ضرورت اور اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس نے امید ظاہر کی ہے کہ لارڈ ڈلہٹی جو خود علم و ادب کے شائق ہیں، اپنے پیش رو کی بات نہ مانیں گے اور اخباروں کو آزادی سے محروم نہ کریں گے۔

علی گڑھ اخبار کا یہ مضمون بھی قابل غور ہے: غدر سے پہلے ہندستانی اخباروں نے حکومت کو آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا تھا لیکن ان کی تاکید پر کسی نے کان نہ دیا۔ تب سے لے کر اب تک ہندستان میں اخبار نویسی نے بڑی ترقی کی ہے۔ اخبار حکومت اور رعایا کے مابین رشتہ قائم کرتے ہیں اور جابر کے مقابلے میں کم زور کا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن تھوڑے سے خود غرض سرکاری اہل کار ان کی خدمات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں — صرف اس وجہ سے کہ ہندستانی اخبار ان کے کرتوتوں کا پردہ فاش کرتے رہتے ہیں۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر کی ایک تقریر نے اخباری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے اور یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں حکومت کا قہر سب اخباروں پر نازل نہ ہو۔ سماج درپن نے یہ کہہ کر اپنی اشاعت بند کر دی ہے کہ حکومت اسے بند کرنا چاہتی ہے۔

لیکن اودھ اخبار کو یہ یقین کامل ہے کہ پریس کی آزادی نہ چھینی جائے گی۔ چناں چہ اس نے اعلان کیا ہے کہ یکم جون سے وہ ہر روز نکلا کرے گا۔ اسی طرح جیسے سورج طلوع ہوتا ہے۔ روزنامہ ہونے کے بعد اس کی ادارت کے فرائض مولوی غلام احمد خاں کی بجائے

سید امجد علی صاحب ادا کرتے ہیں۔ یہ ہندستانی زبان کا پہلا روزانہ اخبار ہے۔ یہ ترقی قابلِ تقلید ہے اور امید ہے کہ اُردو میں جلد اور بھی روزنامے کا اجرا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکی اور روس کی جنگ نے مسلمانوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ یہ جنگ نہ ہوتی تو شاید روزانہ اخبار نکلنے میں دیر ہوتی۔ اسی وجہ سے علی گڑھ اخبار اب ہفتے میں ایک کی بجائے دوبار چھپنے لگا ہے۔ لاہور کا ہفتے وار جریدہ کوہِ نور بھی اب ہفتے میں دو مرتبہ نکلنے لگا ہے۔

بہار سائنٹفک سوسائٹی کا آرگن اخبار الاخیار باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی میں چھپتا ہے۔ اس کا نام چشمۂ نور یا لمعۂ نور ہے۔ مجھے بھی اس سوسائٹی کا رکن ہونے کی عزت حاصل ہے۔

سرابِ عالم کے مصنف سے اودھ اخبار سخت خفا ہے۔ اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے[1]: "اگر دنیا میں سب کچھ مایا ہے تو پھر نیک و بد کا کھٹکا کیوں ہو۔ مصنف نیک نیت سہی لیکن اس قسم کی کتابیں خطرناک ہیں۔ کیوں کہ ہندستانی یوں ہی خیال پرست ہیں۔ انھیں حرکت کی طرف راغب کرنا مشکل ہے۔ اگر ان سے اب بھی یہی کہا گیا کہ زندگی بے کار ہے تو وہ کسی قسم کی ترقی نہ کریں گے۔"

ہندستانی اخباروں میں دل چسپ مضامین کی کمی نہیں ہوتی۔ مثلاً اودھ اخبار میں 'خوش نویسی' پر ایک سیر حاصل مضمون دیکھنے میں آیا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ فن ہندستان میں جس قدر مقبول ہے اور کہیں نہیں۔ یہ مضمون برہان نور کے جناب ستم ظریف کا لکھا ہوا ہے۔

[1] ۱۹ نومبر ۱۸۷۶ء

عنوان ہے: "الخط نصف العلم"۔

لندن سے عربی اور ہندستانی کا ایک نیا مصوّر مجلّہ نکلنے لگا ہے۔ یوں تو رسالہ عربی کا ہے۔ گاہ گاہے ہندستانی، ترکی اور فارسی میں بھی مضمون چھپا کرتے ہیں۔ پیشِ نظر نمبر میں ملکۂ معظّمہ، سلطان زنجبار، سلطان عبدالحمید، سر سالار جنگ، پاپائے اعظم وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ اس کے مضمونوں کا تذکرہ خارج از بحث ہے۔

(۲)

اودھ کے ناظمِ تعلیمات مسٹر جون نیفیلڈ[1] نے اپنے صوبے کی تعلیمی ترقی پر جو سالانہ رپوٹ تیار کی ہے، اس کا ایک حصّہ میں نیچے نقل کرتا ہوں تاکہ ہندی کی حیثیت واضح ہو جائے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ اودھ کے اسکولوں میں ہندی کی بہ نسبت اُردو کے طلبا کی تعداد زیادہ ہے: ہندی اور اُردو کے نام پر جو قضیہ چھڑا ہوا ہے اس سے انجان لوگوں کو دھوکا ہو سکتا ہے کہ اس صوبے میں شاید دو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے، رسم الخط مختلف ہیں لیکن زبان ایک ہے اور اس کا نام ہندستانی ہے۔ لکھنؤ کے عالِم اور گونڈہ کے کسان بہ خوبی ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زبان بنیادی طور پر ایک ہے۔ ہمارے اسکولوں میں اُردو کی جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں ان میں شمالی ہند کی مستند زبان استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن ہندی ریڈروں کا طرز بالکل الگ ہے۔ ایک ہی بات کو

[1] افسوس کہ اس محترم افسر نے ہندستان کو خیرباد کہہ دیا۔ ۱۳ اپریل [illegible] کے اودھ اخبار میں لکھنؤ کے اس الوداعی جلسے کی کیفیت درج ہے جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔

بول چال کی زبان میں لکھنے کی بجائے نامانوس سنسکرت الفاظ میں لکھا جاتا ہی۔ ہندستانی یا تو فارسی سے استفادہ کر سکتی ہی یا سنسکرت سے لیکن مشترک زبان کو ترقی دینے کے بدلے اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو اور ہندی کے نام سے ایک ایسی مصنوعی بولی گھڑی جا رہی ہو جسے بولتا کوئی نہیں اور سمجھتے صرف پنڈت ہیں۔ اس رپوٹ میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پچھلے سال تیس ہزار لڑکوں نے ہندی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں دیہاتی پاٹ شالاؤں کے طلبا اور ہائی اسکول کے متعلم بھی شامل ہیں۔ قدیم ہندی ادب کے مطالعے میں کوئی برائی نہیں۔ ہر ہندو یا مسلمان کو حق ہو کہ وہ اپنی قدیم زبانوں کو پڑھے پڑھائے۔ لیکن ہندی پڑھنے والوں میں سے اکثر نیچی ذاتوں کے لڑکے ہیں اور وہ اس سنسکرت آمیز بولی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر ناگری رسم الخط میں انھی کی بول چال کی زبان پڑھائی جاتی تو کوئی ہرج نہ تھا لیکن ایک ایسی نامانوس بولی پڑھانا جسے نہ کوئی بولتا ہو نہ سمجھتا ہو کہاں کی ہوش مندی ہو۔ یہ ہمارے طریقۂ تعلیم کا سب سے ناقص پہلو ہو۔ یہ کہنا مشکل ہو کہ اس کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ اس معاملے میں ہم نے صوبہ جاتِ شمال و مغرب کی کورانہ تقلید کی ہو۔ پنڈتوں اور پڑھے لکھوں کے جھانسے میں آکر ہم نے بڑی غلطی کی۔ مولویوں اور پنڈتوں کی چشمک کا نتیجہ یہ ہوا کہ بول چال کے الفاظ کا قتلِ عام ہو رہا ہو اور اسی وجہ سے اردو اور ہندی کا امتیاز بڑھتا جاتا ہو۔ اس سے یہ غلط فہمی پھیلتی جاتی ہو کہ یہ دونوں مختلف زبانیں ہیں۔ ادھر آنے سے پہلے میں بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ مسٹر

CROFT کرافٹ نے جو بہار میں اسکول انسپکٹر ہیں ایک کابوآمدپیٹ ان لوگوں کے جواب میں تیار کی ہو جو عدالتوں میں اُردو کی جگہ ہندی کو دلانا چاہتے ہیں۔ مُصنف نے میرے خطبہ کے جواب میں لکھا ہو کہ وہ اسکولوں کے لیے جو ریڈریں لکھوا رہے ہیں ان کی زبان مشترک ہو؛ صرف پانچ فی صدی الفاظ ایسے ہیں جو بدلے گئے ہیں۔ ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اودھ کی صرف ایک مشترک زبان ہو۔ ہندی اور اُردو کا فرق لوگوں کے تخیل کی اپج ہو۔ اور ابتدائی اسکولوں میں جو زبان ہندی کے نام سے پڑھائی جاتی ہو نہ عوام اسے بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔"

راجا شِنو پرشاد نے اس نظریے کی صحت کو ثابت کر دکھایا ہو۔ انھوں نے الہ آباد سے ہندستانی کی گرامر شایع کی ہو جس کا ایک حصّہ 'صَرف و نحو' کے نام سے اُردو خط میں دوسرا 'ویاکرن' کے نام سے ناگری رسم الخط ہو۔ اسی طرح انھوں نے مبتدیوں کے لیے سائنس کی ایک کتاب کا ترجمہ اُردو میں 'حقائق الموجودات' اور ہندی میں 'ودیانکر' کے نام سے چھاپا ہو۔ دونوں کتابوں کے نئے ایڈیشن نظرثانی کے بعد طبع ہوتے ہیں۔

اخبار 'انگلش مین' میں 'ہندی یا اردو' کے نام سے حسب ذیل مضمون شایع ہوا ہو[1]: "حکومت نے ارادہ کیا ہو کہ بہار کے دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری کام ہندی زبان اور ناگری رسم الخط میں ہوا کرے۔ اس بوالعجبی کی وجہ ہماری سمجھ میں نہ آئی کیوں کہ بہار کی

[1] اس جگہ مضمون کا فرانسیسی ترجمہ درج ہو جس کا اُردو ترجمہ کیا گیا ہو۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عدالتوں میں انگریز اور ہندستانی ججوں کی مساوی تعداد ہو اور ان کی تنخواہ اور پوزیشن میں کوئی فرق نہ ہو[1]

ہندستانی اخباروں نے اطلاع دی ہے کہ اعلا ملازمتوں پر ہندستانیوں کو تعنات کرنے کی ایک تجویز پر حکومت غور کر رہی ہے۔ اور امیدواروں کا امتحان ہندستان میں ہوگا۔

تعلیم کی غرض سے ہندستانیوں کو انگلستان کیوں جانا چاہیے۔ اس کے متعلق پنجابی لکھتا ہے کہ[2]: "یہ امر امید افزا ہے کہ ہمارے رؤسا اور شرفا مغربی علوم و فنون کی قدر و قیمت سے واقف ہونے لگے ہیں۔ سنا ہے کہ نواب مالیر کوٹلہ کے بھائی محمد عنایت علی خاں تعلیم کی غرض سے دو سال کے لیے انگلستان جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے نوجوان بہت بڑی تعداد میں ان کی پیروی کریں گے۔

اب بھی ایسے خدا کے بندے ہیں جو کنویں کے مینڈک کی طرح اسی ملک میں بند رہنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ البتہ عیسائیوں کی محبت سے کسی کو پرہیز ہو تو دوسری بات ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو مسلمان انگلستان سے لوٹتے ہیں عوام انھیں بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی انھیں عیسائی کہتا ہے تو کوئی دہریہ۔ ہندوؤں کے ساتھ تو اور بھی مشکل ہے۔ کیوں کہ ملیچھ کی سنگت میں رہنے کے سبب سے وہ فوراً ذات باہر کر دیے جاتے ہیں۔ غرض کہ ہندستانی کے لیے ولایت جانا کالے داغ

[1] علی گڑھ اخبار ۱۳ اپریل [illegible]

[2] ۱۴ اپریل [illegible]

یوں تو ہندو ساری دنیا سے تجارت کرتے ہیں لیکن ولیں باہر جانا پاپ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی حکومت ہندستان تک محدود رہی۔ لیکن جنھوں نے اس حدبندی کو توڑا ان کے جھنڈے دنیا میں ہر طرف بلند ہوئے۔ اب تو ہندو ایسے متعصب ہو گئے ہیں کہ ہندستان سے باہر قدم رکھنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑی جہالت اور کیا ہوسکتی ہے۔ حکومتِ وقت کا تقاضا ہے کہ جو شخص مغربی علوم اور برطانیہ کے طور طریق سے واقف نہیں وہ کسی اچھی اسامی کا اہل نہیں سمجھا جاسکتا۔ دلی دربار میں گورنر جنرل نے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ جو لوگ سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں ان کے لیے ازبس ضروری ہے کہ حکومت کی مرضی کا پاس رکھیں اور اس لحاظ سے انھیں ولایت جانے کی آسانی ملنی چاہیے۔ اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ قابل نوجوانوں کو تعلیمی سفر کے وسائل بہم پہنچانے کے لیے ایک کمیٹی بنانی چاہیے اور اسے چندہ جمع کرنا چاہیے۔ حکومت یقیناً اس کارِ خیر میں امداد کرے گی۔ جو یورپین ہمارے بہی خواہ ہیں وہ بھی اس کمیٹی کی مدد کریں گے۔ اگر اس کمیٹی کی شاخ ہر صوبے میں قائم ہوجائے تو کام میں بڑی سہولت ہو گی۔ اخراجات کا سوال ہے ورنہ ہونہار طلبا کی کمی نہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ولایت کے سفر میں مذہبوں کا اڑنگا نہ لگانا چاہیے۔ اس ضمن میں تمام مذہبی پیشواؤں کا رویہ ایک ہونا چاہیے تاکہ ہندو یا مسلمان طلبا عوام کی حقارت کے ہدف نہ بنیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طلبا کے ساتھ ان کی قومیت کے مطابق مسلمان

اور ہندو باورچی بھیج دیے جائیں۔ پھر تو کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے گی۔

اس معاملے میں کسی ایسے آدمی کو پہل کرنی چاہیے جس پر انگریزی اور ہندوستانیوں کو پورا اعتبار ہو اور جو انگلستان میں ہندستانیوں کی تعلیم کا معقول انتظام کر سکے۔ ہماری رائے میں اس کے لیے ڈاکٹر لائیٹز سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ وہ یورپ اور ہندستان میں یکساں ہردل عزیز ہیں۔ اگر اس تحریک کی ذمے داری اُن کے سپرد کی گئی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہندستانی طلبا کے مفاد کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔

ہر وہ ہندستانی جسے ملک کی عزت کا پاس ہو، ہماری تجویز کی تائید کرے، اس کا فرض ہو کہ اس قسم کی کمیٹی بنائے، اس کے لیے چندہ جمع کرے اور ہندستانیوں کو مغرب کے علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجنے کا انتظام کرے۔"

خبر ہو کہ ڈاکٹر لائیٹز جن کا ذکر اوپر آیا ہو، اس غرض سے انگلستان جا رہے ہیں کہ وہاں ہندستانی طلبا کو یونی ورسٹی کے امتحانوں اور سول سروس کے لیے تیار کرنے کی غرض سے ایک اسکول بنائیں۔ رسوم اور طریقوں کی پابندی کی پوری آزادی ہوگی۔ انھیں لندن کی دل فریبیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شہر سے باہر کسی صحت افزا مقام میں رکھا جائے گا۔ برہمن باورچی رکھے جائیں گے اور گنگا جل لانے کا خاص انتظام کیا جائے گا تاکہ جو ہندو ولایت آئیں، ان پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہو سکے۔ یہ بھی

INDIAN MAIL ملے ۹ ر جون ۱۸۶۶ء

اسی قسم کی تجویز ہی جو پروفیسر مونیرولیمس کے ذہن میں ہی اور جس کا ذکر میں پچھلے مقالے میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔ معلوم ہوتا ہی کہ پروفیسر صاحب کی تجویز پر جلد عمل شروع ہوگا کیوں کہ عمارت کی تعمیر کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہی اس میں سے آدھی سے زیادہ جمع ہو چکی ہی۔ وہ صرف ہندستانی تہذیب سے متعلق کوئی ادارہ نہیں بنانا چاہتے بلکہ ان کا مقصد عالمگیر ہی۔ مشرقی علوم کے مطالعے کا سارا سامان یہاں جمع کیا جائے گا جس میں کتب خانے کے علاوہ ایک میوزیم بھی ہوگا۔

ولایت کے تعلیمی سفر کا ذکر کرتے ہوئے علی گڑھ اخبار نے لکھا ہی[1]: "اب تک ہمارے ملک نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہی۔ ہمارے رہنے سہنے اور سوچ بچار کے طریقوں میں اب تک ایام جہالت کی جھلک باقی ہی۔ ہمارے کردار میں بھی کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوا۔ ہم اب تک لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ تجارت اور علم کے میدان میں ہماری کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اپنی ضروریات کا سامان غیر ملکوں سے منگانے کو ہم مجبور ہیں۔ یہ سامان چین اور یورپ سے آتا ہی۔ روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ ہماری شریعت اور شاستروں میں اور حکومت وقت کے قوانین میں قیامت تک مطابقت باقی رہے گی۔ اس زبوں حالی کو دیکھ کر کس آدمی کا دل نہ بھر آئے گا۔ افسوس اس کا ہی کہ ہمیں اپنی پستی اور ذلت کا

[1] ۱۳ اپریل ۱۸۷۰ء۔ گارساں دتاسی اُردو سے فرانسیسی ترجمہ کیا ہی۔ اب اس فرانسیسی عبارت سے اُردو میں ترجمہ کیا جاتا ہی۔

مطلق احساس نہیں اور اپنے انحطاط سے ہم کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ آخر ہماری اصلاح اور ترقی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ جدید علوم و فنون سے آشنا ہونے کے لیے اب تک ہم نے باقاعدگی سے کسی تدبیر پر عمل نہیں کیا۔ مغرب کی روشنی سے مشرق کی تاریکی کو اُجالنے کے لیے ہم نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہم تک اُس روشنی کی ایک آدھ کرن پہنچی بھی ہے تو اِدھر اُدھر سے چھن کر۔ ہمیں نہایت غلط طریقے سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ حالاں کہ حکومت میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن اسے ہمارے حقوق کا خیال ہے اور اُس نے ملازمت کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں اور ہمیں اپنی اصلاح کا راستہ سمجھایا ہے۔ لیکن ہم اس قدر کاہل ہوگئے ہیں کہ اس برکت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ اگر راجہ اور نواب اس طرف توجہ کریں تو ہندستانی طلبہ بہت بڑی تعداد میں انگلستان جاسکتے ہیں اور وہاں کے علم و ہُنر سے بہرہ مند ہوکر اس ملک کو شاہ راہِ ترقی پر چلا سکتے ہیں۔ ہم ان سے اپیل کرتے ہیں کہ اس معاملے کی اہمیت پر غور کریں۔ سرسالار جنگ کو لائق معاونوں کی ضرورت ہے لیکن ہندستان کے مسلمانوں میں چراغ لے کر ڈھونڈیے کوئی کام کا آدمی نہیں ملتا۔ اگر ہماری رائے پر عمل کیا گیا تو ہزاروں ہندستانی تھوڑے سے عرصے میں جدید علوم پر عبور حاصل کریں گے اور ان کی مدد سے ملک جتنی ترقی کرے گا اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔"

علی گڑھ اخبار کے ایک دوسرے نمبر میں سرسید احمد خاں نے

انگریزی اور اُردو میں اسی مسئلے کو زیادہ وضاحت سے لکھا ہے[۵۱]۔ مس کارپینٹر نے ہندستانی طالبات کو مغربی تعلیم دینے کی تحریک شروع کی ہے اُس نے بمبئی اور مدراس کے شعبہ ہائے تعلیمات کو لکھا ہے کہ جو لڑکیاں تعلیم کی غرض سے ولایت آئیں گی میں بلا کسی عوض کے ان کی نگرانی کروں گی[۵۲]

دلی دربار کے بعد ۱۶ر جنوری کو وائسرائے پٹیالہ تشریف لے گئے اور بڑے تزک و احتشام سے کم عمر مہاراجا کی تخت نشینی کی رسم ادا کی۔ پھر وہ کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کی غرض سے علی گڑھ گئے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ اسلام ہر قسم کی ذہنی ترقی کے حق میں ہے۔ مغرب اپنے علم کے لیے مشرق کا مرہون منت ہے اور اس وقت اس فرض کو واپس کر رہا ہے۔ لارڈ لٹن نے سید صاحب اور دوسرے اصلاح پرور مسلمان اکابر کی بڑی تعریف کی[۵۳]

سہارن پور کے مسلمانوں نے آج سے گیارہ سال پہلے عربی کا ایک مدرسہ بنایا تھا۔ اس عرصے میں ہزارہا طالب علم وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکل چکے ہیں اور سہارن پور کے علاقے کو اس ادارے نے خاص طور پر فائدہ پہنچایا[۵۴]۔ یہ مدرسہ چندے سے چلتا ہے اور اخباروں نے چندہ دہندگان کی فہرست چھاپی ہے۔

---

۵۱ ۲۷ر اپریل ؁۷۷ء

۵۲ INDIAN MAIL ۲ر جون ؁۷۷ء

۵۳ INDIAN MAIL یکم فروری ؁۷۷ء

۵۴ اودھ اخبار ۱۶ر جنوری ؁۷۷ء

"مسلمانو، خوابِ خرگوش سے جاگو!" کے عنوان سے 'پاینیر' نے ایک مضمون لکھا ہی۔ اس نے کشن گڑھ کے مسلمانوں کی ایک عرضی کا حوالہ دیا ہی جو حکومتِ بنگال کے آگے پیش ہو۔ اس میں شکایت کی گئی ہی کہ بنگال کے مسلمان انگریزی سے ناواقف ہیں اس لیے تمام ملازمتیں ہندووں کو دے دی گئی ہیں۔ جس جج کے پاس یہ عرضی پہنچی اس نے حاشیے میں لکھ دیا کہ مسلمان اپنی زبان کی طرف سے بھی بے پروا ہیں۔ اگر ان میں لیاقت نہیں تو حکومت کیوں کر اپنا کام بند کر دے۔ اسے تو بہر حال لائق ملازموں کی ضرورت ہی خواہ کسی قوم کے ہوں لیکن صوبے کے لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا ہی کہ مسلمانوں سے انصاف کا سلوک ہونا چاہیے اور ہندووں کی بے جا طرف داری نہ کی جائے۔

اب تک ہندستان میں یورپین تعلیم کی ترویج کیا کرتے تھے۔

اس کے صلے میں والیانِ ریاست نے فیصلہ کیا ہی کہ ان کے خرچ سے انگریز حکام کی لڑکیوں کے لیے شملے میں ایک کالج قائم کیا جائے[ل]۔

یورپینوں کی دیکھا دیکھی بعض ہندستانیوں میں بھی تعلیمِ نسواں کا چرچا ہو چلا ہی۔ یہ لوگ بڑے جوش و خروش سے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت کر رہے ہیں اور ایسا نہیں کہ انھیں کامیابی نہ ہوتی ہو۔ اس کے متعلق مجھے کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہی۔ کچھ لڑکیاں حصولِ تعلیم کے لیے یورپ آئی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک کا نام نشی کانت چٹرجی ہی۔ لینزگ یونی ورسٹی سے ڈپلوما لینے کے بعد اسے سینٹ پیٹرس برگ (روس) میں سنسکرت، بنگالی اور ہندستانی کے پر... کی جگہ مل گئی۔

لہ Indian Mail ۱۹ مارچ سنہ

سالِ رواں کے آغاز میں علی گڑھ میں مسلمانوں کے شان دار کالج کا قیام مغربی تعلیم سے اس قوم کے وصال کی گویا پہلی ساعت ہے۔ یہ مسلمان اصلاح پسندوں کی سب سے بڑی جیت ہے۔ قدامت پرست مسلمان پہلے اس تجویز کے مخالف تھے اور سید صاحب پر اشاعتِ الحاد کا الزام لگاتے تھے۔ سر سالار جنگ نے کالج کی جو امداد کی، وہ دربارِ حیدر آباد کی برہمی کا باعث ہوئی لیکن رفتہ رفتہ تعصب کی گرد چھٹتی گئی اور اب شمالی ہند کے بہت سے سربرآوردہ مسلمان ان کے حامی ہیں۔ دو سال پہلے چندہ سے بمشکل تین لاکھ رُپے جمع ہوئے تھے اور یہ مطلوبہ رقم کے پانچویں حصے سے زیادہ نہ تھا لیکن سر ولیم میور نے علی گڑھ میں جو ولولہ انگیز تقریر کی، اس نے آن کی آن میں ڈیڑھ لاکھ رُپے کا اضافہ کر دیا۔

کالج دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک میں سائنس اور آرٹ کی تعلیم دی جائے گی اور اُس کی تنظیم میں برطانی یونی ورسٹیوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ دینیات کی تعلیم کا خاص انتظام ہے۔ اس شعبے کے لیے ساٹھ وظیفے مقرر کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی مالیت دس سے پچیس رُپے ماہانہ تک ہے۔ انگلستان کے مقابلے میں یہ رقم حقیر معلوم ہو گی لیکن ہندستان میں ایک طالبِ علم چند رُپے میں رہ سکتا ہے۔ ہر سال سب سے ذہین چھ طلبا کا انتخاب کیا جائے گا، وہ 'فیلو' کہلائیں گے اور انھیں چھ سو رُپے سالانہ کا وظیفہ ملے گا۔ اگر وہ چاہیں تو یہ وظیفہ سات سال تک جاری رہے گا۔

نارائن سنگھ نے ویدوں کی تعلیم کے لیے الہ آباد میں ایک

پاٹ شالا کھولا ہی۔ اس کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہی جس کے آٹھ ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سال میں پچاس روپے دیتا ہی جس سے پاٹ شالا کا خرچ چلتا ہی۔ ہندستانی میں پڑھائی ہوگی۔ الہ آباد میں سنسکرت کا ایک اسکول عرصے سے قائم ہی۔ وہاں بھی اسی طریقے پر عمل ہوتا ہی۔

سر سالار جنگ کے ایما پر حیدر آباد کے رئیسوں نے جاگیرداروں کے لڑکوں کے لیے ایک کالج قائم کیا ہی۔ سر سالار جنگ نے اپنے دو بیٹوں کو اس میں داخل کیا ہی۔ اس کا نام 'مدرسۃ العالیہ' ہوگا اور یہ ہر معاملے میں علی گڑھ کالج کی پیروی کرے گا۔ اس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور انگریز بھی داخل ہو سکیں گے۔ انتظام ایک خاص کمیٹی کے سپرد ہوگا۔ بمبئی کے منشی غلام محمد اپنی قوم میں تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں اچھا کام کر رہے ہیں۔

صوبہ جاتِ شمال و مغرب کے 'برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کے صدر سید احمد خاں ہیں۔ اس نے پارلیمنٹ سے درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہی کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر ۲۲ سے گھٹا کر ۲۱ سال کر دی جائے۔ بابو سریندر ناتھ بنرجی اس کی کوشش کے لیے انگلستان جانے والے ہیں۔

(۵)

پچھلی مرتبہ میں نے 'آریہ سبھا' کا ذکر کیا تھا۔ اب اخبار انجمن پنجاب کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ الہ آباد میں یہ سبھا اس مقصد سے قائم ہوئی ہی کہ قصے کہانیوں کا ترجمہ ہندی میں کرے۔ اس کا ارادہ ہی کہ سنسکرت

بنگالی، گجراتی وغیرہ کے افسانوی ادب کو ہندی میں منتقل کرے۔ چندے سے ڈھائی ہزار روپیہ جمع کیا جائے گا اور اس سرمایے سے کتابیں شائع ہوں گی۔ اشاعت سے پہلے پنڈتوں کی کمیٹی مسودوں کی تصحیح کرے گی۔

اخبار نویس نے لکھا ہے کہ: "ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ہندی ادب کو فروغ دینے کی غرض سے یہ سبھا بنی ہے۔ امید ہے کہ اس کی کوشش سے ہندی قعرِ پستی سے نکل کر بلند مرتبہ حاصل کرے گی۔ لیکن سبھا کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ محض قصے کہانی کی کتابوں کی اشاعت کرے گی۔ ہر سمجھ دار آدمی کہے گا کہ رومانوں اور افسانوں کا مطالعہ محض تضیعِ اوقات ہے۔ ایسی بے کار کتابوں کی اشاعت سے لوگوں کا سراسر نقصان ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اہلِ وطن اب تک سنجیدہ چیزوں کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ اگر وہ بے کار چیزوں میں وقت گنوائیں گے تو یہ وقت و محنت کی بربادی ہے۔

اس سبھا کو ہم مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ بخوشی ہندی کی ترقی کے لیے ہی کوشاں رہے لیکن مفید علوم و فنون کی کتابوں کو دوسری زبانوں سے منتقل کرے، اس میں سنسکرت یا انگریزی کی قید نہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ ثابت قدمی سے اس راہ پر چلے گی تو ملک کا بھلا ہوگا اور اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایشیا کو اب بھی جن اور پریوں کے قصوں کا چسکا ہے، لیکن ہمیں یہ روش ہرگز پسند نہیں۔ ہمیں تو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس سے ملک کا فائدہ ہو"

اندور میں ایک مجلس مناظرہ ہے۔ مہاراجہ دتیا کے بھائی نے

۲۲ نومبر ۱۸۷۹ء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]

انجمنِ ہند کے صدر منشی پیارے لال اور اودھ اخبار کے مالک منشی نول کشور کی تحریک پر لاہور میں یکم اپریل کو ایک جلسہ اس غرض سے ہوا کہ بیاہ شادی کی فضول خرچی کی روک تھام کی تدبیر سوچے۔[1]

اسی طرح کا ایک جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اودھ اخبار نے بالتفصیل اس کی روئیداد شائع کی ہے۔ مشکل یہ کہ جو لوگ اس اصلاح کی زبانی تائید میں سب سے پیش پیش ہیں، عمل کے وقت وہ بہت بڑا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حال ہی میں مہاراجا ڈمراؤں کی نواسی کی شادی میں چار لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔

پنجابی کی اطلاع ہے کہ مولوی سید امداد علی کی درخواست پر لارڈ لٹن نے ...... سائنٹفک سوسائٹی کی سرپرستی قبول کر لی ہے۔

احمد آباد میں قدیم ہندستانی صنعت کی حوصلہ افزائی کے مقصد سے ایک انجمن بنی ہے۔ اس کی طرف سے ایک نمائش بھی ہونے والی ہے جس میں ملکی آرٹ کے عمدہ نمونے جمع کیے جائیں گے منشی نصرت علی دہلوی نے میری معرفت انگریز کمشنر مسٹر اودن کو خوش نویسی کے نمونے اور باقیاتِ دلّی کی جو قلمی تصویریں بھجوائی تھیں، وہ فنّی نقطۂ نظر سے لاجواب تھیں۔

پونہ میں ایک 'سارو جنک سبھا' (انجمنِ رفاہِ عام) ہے۔ اس کے بانی اور مہتمم گنیش واسودیو ہیں۔ وہ کلکتہ، بنارس وغیرہ میں ہندستان کی ترقی کے ذرائع پر تقریریں کر چکے ہیں۔ سبھا کا بنیا سے کردہ

[1] اودھ اخبار ۲ اپریل ۱۸۷۷ء

یورپ جانے والے ہیں ۔ سبھا بیواؤں کی شادی کا پرچار بھی کرتی ہے۔ اور شاید اسی کا اثر ہے کہ پونہ میں پہلی بار ایک جوان برہمن بیوہ اور ایک رنڈوے کا بیاہ دیکھنے میں آیا ۔

کلکتہ کی انجمن اسلامیہ بڑے شوق سے علمی خدمت انجام دے رہی ہے ۔ بنگال کونسل کے رکن مولوی عبداللطیف خاں بہادر نے آج سے چودہ سال پہلے اس کی داغ بیل رکھی تھی اور وہی اس کے سکریٹری ہیں ۔ مہینے میں ایک بار اس کا جلسہ ہوا کرتا ہے ۔ انجمن کا مقصد ہے کہ بلاقید زبان مسلمانوں کو علمی و ادبی تحریکوں سے باخبر رکھے ۔ اس کی کوشش سے مسلمانوں میں تعلیم کا شوق بڑھ گیا ہے اور اس کے جلسوں کا ہر طرف چرچا رہتا ہے ۔ حکومت بنگال اور کلکتے کی یورپین ایسوسی ایشن نے اس کی بہت تعریف کی ہے ۔ اس کے ارکان کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے اور ان میں سے ہر ایک انجمن کے کاموں میں تھوڑا بہت حصہ لیتا ہے ۔ اس کا سالانہ جلسہ ٹاؤن ہال میں ہوا کرتا ہے جس میں ہر قوم و ملت کے افراد آتے ہیں اور علمی و ادبی مسئلوں پر آزادی سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں ۔ سنہ ۶۹ء میں ڈیوک آف ایڈنبرا انجمن کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے تھے ۔ اب کے انجمن کا ڈیپوٹیشن بنگال کے نئے گورنر مسٹر ایڈن کے استقبال کو بھیجا گیا تو وہ اس سے بڑی عزت سے پیش آئے ۔

مولوی عبداللطیف کے صاحب زادے عبدالرحمٰن تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر اسی قسم کی چھوٹی سی انجمن بنائی ہے ۔ اس کا مقصد ہے کہ مغربی علم و ادب

سے طلبا کو شغف پیدا ہو۔ یہ لوگ 'مدرسہ لٹریری گزٹ' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے ہیں جس میں نظم و نثر کے عمدہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔

انجمنِ اسلامیہ بمبئی نے سالِ گزشتہ کی رپوٹ شائع کی ہے۔ اس کا اصل مقصد مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت ہے اور وہ اس پر مستعدی سے کاربند ہے۔

ایک انجمن ادبِ عامہ بھی ہے[۵۱] اس کا نظریہ یہ ہے کہ مروّج زبانوں میں مثلاً اردو، تامل، تیلگو وغیرہ میں انگریزی کی دلچسپ اور ساتھ ساتھ کارآمد کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ اس نے ہندستانی کہاوتوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اودھ اخبار کا بیان ہے کہ[۵۲] "یوں تو ہندستان میں بہت سے میلے لگا کرتے ہیں لیکن بتار کا میلہ اپنے قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ جنھوں نے اسے دیکھا ہے وہ اس کے انوکھے پن کی تصدیق کریں گے۔ اس میں جنگلی اور پالتو جانور لاکھوں کی تعداد میں بکری کے لیے آتے ہیں۔ ایک شخص نے حساب لگا کر بتلایا ہے کہ صرف گھوڑوں کو لیجیے تو ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوتے۔ ایسا عجیب و غریب میلہ اور کہاں لگتا ہوگا۔ گو کہ اب گھوڑوں کی مانگ کم ہوگئی ہے۔ لیکن فوجیوں، تاجروں، راجاؤں اور شوقینوں کو اب بھی ان کی ضرورت ہے اور وہ سب گھوڑوں کی تلاش میں یہاں آتے اور ہزاروں کا سودا کرکے جاتے ہیں۔ جانوروں کے علاوہ ملک بھر سے انواع و اقسام کا

۵۱ Journal of the National Indian Association نومبر ۱۸۸۶ء
۵۲ ۱۲ نومبر ۱۸۸۶ء

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

پرگنہ نگم کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں سے دس کوس کی دوری پر شیخ نورالدین کا مزار ہے جس کی زیارت کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ میلا ہر سال بڑی دھوم دھام سے لگتا ہے ہندو مسلمان ہزاروں کی تعداد میں یہاں دو تین ہفتے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور کھیل کود اور ناچ رنگ کی محفل سجاتے ہیں۔ ہندوؤں کا بیان ہے کہ مزار دراصل ایک رشی سہجانند نامی کا ہے، کیوں کہ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے اس لیے ہندو مسلمانوں میں کوئی تمیز نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ہندوؤں نے اپنے جلانے کا اور مسلمانوں نے دفن کرنے کا ارادہ کیا۔ مسلمانوں کی چل گئی اور انھوں نے لاش کو دفن کرکے اس پر مقبرہ بنا دیا۔ مقبرہ بن کر تیار ہوا تھا کہ ایک دھماکا ہوا اور مقبرہ کھل گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ کفن چاک چاک ہے اور لاش غائب ہوگئی ہے[۱]

پنجابی کی راے ہے کہ اس روایت سے کم سے کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ بزرگ ہندو مسلم اتحاد کے عَلَم بردار تھے، اسی وجہ سے دونوں قوموں کو ان سے عقیدت تھی[۲]

لیکن پچھلے سال ایک میلے میں افسوس ناک حادثہ ہوگیا۔ برہمنوں اور جوتشیوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ پاپ دھونے کے لیے ۲۵ر فروری کی تاریخ سب سے مناسب ہوگی۔ اس دن سب کو اجودھیا جاکر سرجو ندی کے اس گھاٹ پر نہانا چاہیے جہاں رام چندرجی نے اشنان

۱؎ کبیر داس کے جنازے کا قصہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔

۲؎ ۲۵ر نومبر ۱۸۶۷ء۔

کیا تھا۔ چالیس چھ بارہ لاکھ ہندو اس مہورت میں نہانے کے لیے وہاں جمع ہوئے۔ ایسی بھیڑ لگی کہ تین چار سو ہندو وہاں کچل کر مر گئے۔ اس کی تفصیل اس قدر بھیانک ہے کہ میں اسے تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ بھیڑ یا دھسان کے سوا اس حادثے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۴)

اسلام کے خلاف مغرب کا تعصب روز بہ روز کم ہوتا جاتا ہے۔ پچھلے سال میں نے مسٹر بوزورتھ اسمتھ کی کتاب کا ذکر کیا تھا۔ اس مرتبہ میرے انگریز شاگرد مسٹر Salisbury سالسبری نے ایک عالمانہ کتاب اسلام کی حمایت میں لکھی ہے۔ سید امیر علی سے ہم نوا ہو کر انھوں نے لکھا ہے کہ: "وہ دن جلد آئے گا جب اسلام قالب کی قید سے نجات پاکر اپنی روح کو بچائے گا اور عیسائیت کے دوش بہ دوش شاہراہِ تہذیب پر گامزن ہوگا۔ کیوں کہ دونوں کا مقصد ایک ہے یعنی انسانیت کی برتری۔ دونوں میں تضاد کی کوئی وجہ نہیں۔"

مسٹر Salisbury کی بھی رائے ہے کہ اسلام قدیم یہودیت کا نیا روپ تھا۔ ان کی طرح میرا بھی خیال ہے کہ اسلام اپنے زمانے کے لیے ضروری تھا اور اس نے کلامِ ربانی کی یاد از سرِ نو تازہ کی۔ عیسائیت کے انحطاط اور شرک وکفر کے فروغ کے زمانے میں اس نے دنیا کو اخلاق و اخوت کا پیغام سنایا۔ روحانیت کے بجھتے ہوئے چراغ کو اس نے اکسایا اور مسلمان فلسفیوں نے کمالِ رواداری سے یونانی فکر کے جوہر کو زندہ کیا۔ محمد پر تہمت پرستی کا بہتان صریحاً بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ انجیل کی طرح قرآن بھی انسان

[illegible] Dods [illegible]

[illegible] Hughes [illegible]

[illegible] Badger [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] LONG [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] POOLE [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] STOBART [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

کے علاوہ کسی دوسرے عیسائی فرقے کا حلقہ بگوش ہونا چاہیے تو شہر سے نکال دیا جائے گا۔ اگر کوئی مذہب بدلنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اسے تہذیبِ نفس کے لیے پادریوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کی جایداد ضبط کر لی جاتی ہے۔ اپنے فرقے سے باہر شادی کرنے کی ممانعت ہے اور ہر عیسائی بچہ خواہ روسی کلیسا کی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ کوئی نیا مذہبی فرقہ قائم کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ ان سختیوں اور پابندیوں کے باوجود روس میں اسلام کا زور بڑھتا جاتا ہے اور اس کا حلقۂ اثر شمال کی طرف پھیلتا جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اِدھر تو عیسائی فرقوں میں ناچاقی بڑھتی جاتی ہے اُدھر مسلمان شیعہ سُنّی کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ سیّد احمد خاں اپنے کالج میں سُنّی اور شیعہ طلبا میں کسی امتیاز کی اجازت نہیں دیتے۔ ایک نام ور شیعہ شاعر منیر الایمان نے اخبار پنجابی میں ایک مثنوی شیعہ سنّی اتحاد پر شایع کی ہے۔ بہت سے شیعہ اکابر نے جی کھول کر اس کی داد دی ہے[1]۔

میرا خیال ہے کہ ہندستان کی اسلامی انجمنوں میں بھی اسی اتحاد کی فضا موجود ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ ان انجمنوں کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے۔ پنجابی نے لاہور کی انجمنِ اسلامیہ کے ایک جلسے کا حال لکھا ہے جو ۱۵ اپریل کو شاہی مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں[2] کے اکثر معزز مسلمان شریک تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجدوں

[1] پنجابی ۱۲ اپریل ۱۸۸۸ء

یں شادیوں کے رجسٹر رکھنے چاہییں تاکہ اگر کسی میاں یا بیوی کی شکایت پہنچے تو تحریری ثبوت موجود ہو۔

اب تک حکومتِ ہند وہابیوں کو اپنا دشمن سمجھتی تھی۔ اس سلسلے میں دلّی دربار کے موقع پر ایک اخبار نے لکھا تھا کہ "ایک وہابی لیڈر امیر خاں کو عمر قید کی سزا ملی تھی۔ وہ کلکتہ جیل میں قید ہیں۔ دربار کے موقع پر ان کے لڑکے اور لڑکی نے وائسرائے کی خدمت میں ان کی رہائی کی درخواست بھیجی۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ سال بھر پہلے کئی باثر یورپین اور ہندستانی شرفا نے لارڈ نارتھ بروک سے ان کی سفارش کی تھی لیکن اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ امیر خاں کی عمر کوئی نوّے سال ہوگی۔ وہ اتنے کم زور ہو گئے ہیں کہ حکومت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس صورت میں امید ہے کہ لارڈ لٹن ان سے رحم کا سلوک کریں گے"[۱]

پہلے حکومت سارے وہابی فرقے کو اپنا دشمن خیال کرتی تھی اور ان سے ویسا ہی سخت سلوک کرتی تھی جس کی مثال یورپ کی تاریخ میں کم یاب نہیں ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اب حکومت کا رویّہ بدلتا جاتا ہے۔ علی گڑھ اخبار کی اطلاع ہے[۲] کہ حکومتِ پنجاب نے وہابیوں کے متعلق جو فرمان نکالا ہے وہ اس کی انصاف پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ فرمان ہر ترقی پسند حکومت کے شایانِ شان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکموں نے خیالی دشمن

---

[۱] Indian Mail – ۲۹ جنوری [illegible]ء

[۲] ۲۹ دسمبر [illegible]ء

کے خوف سے نجات حاصل کرلی ہے اور اس بے بنیاد خوف کی وجہ سے وہ رعایا کو اس کے جائز حقوق سے محروم نہ رکھیں گے۔ حکومت اتنی اندھی نہیں کہ رعایا کے ایک طبقے کی نیت پر شبہہ کرے اور یہ اعتراف نہ کرے کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ بے بنیاد تھی۔

یہ باور کرنا مشکل ہے کہ بلاسبب ایک پورا فرقہ موردِ عتاب قرار دیا جائے۔ اس فرقے کے عقیدے اور طریقے سے ہماری جو واقفیت ہے اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یہ امر ثابت ہو چکا تھا کہ پنجاب کے وہابی اپنی فرماں برداری میں دوسروں سے کم نہیں۔ لہٰذا حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ ایک اعلان کے ذریعے ان کی نیک چلنی کی شہادت دے اور ان پر سے جھوٹے الزاموں کا داغ دھو دے۔ شکر ہے کہ اس نے اپنے فرض کی پابندی کی۔ پنجاب کی وہابی جماعت نے ایک ایک اطاعت نامے میں اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا ہے۔ امید ہے کہ اب ان سے ویسی ہی خوش سلوکی برتی جائے گی جو رعایا کے دوسرے افراد کے لیے روا رکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ چند آدمیوں کے جُرم کی سزا ایک پوری جماعت پر عائد نہیں ہوسکتی۔

حکومت نے اپنے فرمان میں اعلان کیا ہے کہ وہابیوں کو اپنے عقیدے کی پابندی کی کامل آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ امنِ عامّہ کے خلاف کچھ نہ کریں۔ یہ شرط بہت مناسب ہے اور سب پر یکساں منطبق ہوتی ہے۔

اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہابیوں کو ان مسجدوں کے

استعمال کا حق نہ ہوگا جو دوسرے مسلمانوں کے سرمایے سے بنائی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس امتناع کا مطلب صرف یہ ہو کہ جو مسجدیں خاص فرقوں کے لیے مخصوص ہیں ان میں جاکر اپنے طریقے سے نماز پڑھنے کا حق وہابیوں کو نہ ہوگا۔ تمام مسجدوں کے دروازے ان کے لیے بند نہیں کیے جاسکتے۔ سرکاری اعلان کی یہ بات ہمیں خاص طور پر پسند آئی کہ جو وہابی سرکاری ملازم ہیں ان سے کسی قسم کا تعصب نہ برتا جائے گا اور انھیں مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔"

اس اعلان کی اشاعت کے موقع پر 'پنجابی' نے پالم پور کے پروفیسر عبدالرحمان کا مضمون وہابیوں کی تاریخ پر چھاپا ہی۔ اس کے پُر از معلومات اور دل چسپ ہونے میں شک نہیں۔ لیکن ایسی کوئی نئی بات نہیں ہی جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔

علی گڑھ اخبار نے اُردو گائڈ کا ایک مضمون نقل کیا ہی[1] در اصل یہ ترجمہ ہی عربی کے مشہور عالم اور مسلمانوں کے مخلص بہی خواہ ناسولی NASSEAULEE کی تحریر کا۔ فاضل مضمون نگار نے ترکی سے مسلمانوں کی ہم دردی کو سراہا ہی اور ان سے اپیل کی ہی کہ روس کے خلاف متحد ہوکر اپنی حفاظت پر کمر بستہ ہوں۔ یہ اتحاد بہت پایدار ہی اور ہندستان میں شیعہ سنّی سبھی ملّت کی حفاظت کے لیے مالی امداد کر رہے ہیں۔ عورتوں نے اپنے زیور تک دے دیے ہیں اور مسجدوں میں روس پر لعنت بھیجی جا رہی ہی۔

ملہ ۱۶ فروری [illegible]۔ یہ مضمون لندن کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

علی گڑھ اخبار نے ایک مضمون میں زارِ روس کا مقابلہ دجّال سے کیا ہے۔
اسی اخبار نے 'نظام الملک' نامی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے۔
یہ روس اور ترکی کی جنگ پر ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ میرزا
فیروز حسین دہلوی کی تصنیف 'فیروز نامۂ ترک' کا بھی بڑا چرچا ہے۔
یہ عثمانیہ سلاطین کی تاریخ ان کی تصویروں کے ساتھ ہے۔ ہندستانی
اخباروں میں موجودہ جنگ کے علاوہ اور کوئی خبر نہیں ہوتی۔
لوگوں کی دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ اخبار میں اور کچھ نہیں پڑھنا چاہتے۔
جب کبھی ترکوں کی فتح ہوتی ہے مسجد میں نمازِ شکرانہ ادا کی جاتی ہے۔
فرانس کی حکومت رواداری کے معاملے میں برطانیہ کی
پیروی نہیں کرتی۔ اس نے 'الجیریا' کے عربی جریدہ "الجواب" کو
اس لیے بند کر دیا کہ وہ عیسائیوں کے مقابلے میں ترکوں کی حمایت
کرتا تھا۔

بہت سے ہندی مسلمان ترک فوج میں بھرتی ہونے کے
لیے اپنے ملک سے ہجرت کر گئے ہیں۔ ترکی کی شان میں صدہا قطعات
اور قصیدے لکھے گئے ہیں اور ہر اخبار انھیں نقل کرتا ہے۔

(۷)

اخبار 'نیرِ اعظم' نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی تقریباً ایک
ارب ۳۴ کروڑ ہے۔ اس میں سے ۳۳½ کروڑ عیسائی، ۱۲ کروڑ مسلمان
اور نصف کروڑ یہودی ہیں۔ باقی بُت پرست ہیں۔
پچھلے سال ستمبر کے مہینے میں پادری ونٹر نے دِلّی کے ایک کلیسا
میں ۸۵ آدمیوں کو عیسائی بنایا۔ ان کے رفیقِ کار پادری لالہ تارا چند ہیں۔

دونوں کے ساتھ ستّرہ مبلغ اور مقرر کام کرتے ہیں۔ انھوں نے بہتیرے ہندو مسلمانوں کو عیسائی بنایا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ نیپال کے کسی امیر گھرانے کی مسلمان خاتون انجیل پڑھ کر عیسیٰ پر ایمان لے آئی گوکہ اس وقت تک وہ کسی مشنری سے نہ ملی تھی۔ پانچ روز کا سفر کرکے وہ اپنے تین رشتے داروں اور چار بچوں کے ساتھ بپتسمہ لینے کلکتہ آئی۔ ہوشیار پور کے پادری چیٹرجی نے خبر دی ہے کہ دو مسلمان فقیر عیسائی ہوگئے۔ ان میں سے ایک حج کر آیا تھا اور دوسرے کا نام موسیٰ شاہ ہے۔

کبھی کبھی سر پھرے لوگ پادریوں کو بہت دق کرتے ہیں۔ صوبۂ بمبئی میں ایک کن پھٹے جوگی نے مہادیو کا اوتار ہونے کا دعوا کیا اور جرمن پادریوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گیا۔ تنگ آکر انھوں نے حاکمِ ضلع سے شکایت کی۔ جوگی کو قانون کی خبر نہ تھی۔ جب اس کی گوش مالی ہوئی تو اس نے معافی مانگ کر جان بچائی۔[1]

زمانۂ حال کے نو عیسائیوں میں پادری نیمیہ گورا بہت ممتاز ہیں۔ یہ قوم کے مرہٹے ہیں اور بنارس کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب Rational Refutation of Hiduism (ہندو مذہب کی عقلی تردید) بہت قابلِ قدر ہے۔ دو سال پہلے انھوں نے بمبئی اور پونہ میں جو تقریریں کی تھیں، وہ بمبئی سے شائع ہوئی ہیں۔ تقریروں میں ان ہندستانیوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو مغربی تعلیم

[1] علی گڑھ اخبار۔ ۳ اکتوبر [illegible]ء

حاصل کر کے عزیز قدیم کی لغویتوں سے واقف ہو چکے ہیں اور ویدوں یا برہمنوں کی اصلیت کو پہچان گئے ہیں۔ یوں بھی ہمارا تخاطب برہمو سماجیوں کی طرف ہو۔ انھوں نے عیسائیت سے بہت کچھ سیکھا ہو لیکن اس میں کچھ تصرف بھی کر دیا ہو جس کی وجہ سے دوسرے ہندستانیوں کی طرح وہ بھی عیسیٰ کی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ ان تقریروں میں پادری گوراے اس عام خیال کی تردید کی ہو کہ کوئی آدمی جب جی چاہے نیا مذہب گھڑ سکتا ہو۔

پادری MURREY مرے کے آجانے سے دلّی مشن کو بڑی تقویت ہو گئی ہو۔ یہ کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔

پنجاب کی عیسوی انجمنِ ادب نے دلّی دربار کے موقع پر اپنی کتابوں کے بیچنے کا خاص انتظام کیا تھا۔ ایک شامیانے میں انجمن کی مطبوعات خوش اسلوبی سے سجا کر رکھی گئی تھیں۔ شامیانے میں زیادہ کتابیں نہ بکیں لیکن راجاؤں کے ڈیروں میں انگریزی اور ہندستانی کتابوں کی بہت کھپت ہوئی۔

"لکھنؤ وٹنس" کا بیان ہو کہ مشنری میلوں کا خوب چکر لگاتے ہیں کیوں کہ وہاں لوگوں کی بڑی بھیڑ لگتی ہو۔ غرض کہ عیسائیت کی تبلیغ وہ ہر مناسب موقع پر کرتے ہیں اور اس میں کبھی نہیں چوکتے۔ حسبِ ذیل کتابوں کی خاص طور پر اشاعت کی جاتی ہو:

عیسیٰ گیت کی کتاب۔

برادر صاحب کی نصیحتیں

شنگم کسٹلین کا اقرار نامہ

تاریخ اولیا
ہدایت المسلمین از پادری عماد الدین
ابطالِ دینِ محمدی
تاریخِ کلیسا از سر ولیم میور
میزان الحق از ڈاکٹر فینڈر

اس سوسائٹی کی رپوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں سب ملا کر چار سو کتابیں شایع کی گئی ہیں۔ ان سب کے نام گنانا ناممکن ہے۔ البتہ پادری کلارک کی 'انجیلِ متی کی تفسیر' اور پادری عماد الدین کی 'خزانۃ الاسرار' کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آخر الذکر کتاب کا حجم ۵۱۸ صفحات ہے اور وہ لدھیانہ میں چھپی ہے۔ لیکن اس سوسائٹی کی سب سے عجیب و غریب کتاب کا نام 'آئینۂ دل' ہے۔ اس میں دس مثالی تصویریں دی گئی ہیں جن میں گناہ گار کے قلبِ سیاہ اور نیک آدمی کے قلبِ روشن کی مختلف کیفیتیں بتائی گئی ہیں۔

'عیسیٰ کا نقشِ قدم' کا اُردو ترجمہ میرزا پور کے پادری ہاولٹ Howlett نے کیا ہے۔ پہلے وہ اگسطین کے اقرار نامے کا نہایت عمدہ ترجمہ کر چکے ہیں۔

اتوار کے دن گائے جانے والے ہندستانی بھجنوں کا ایک نیا مجموعہ شایع ہونے والا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو بھجن اور غزلیں ہوں گی۔ 'عیسوی کلیسا کی تاریخ' مسٹر زبنکر نے بڑی محنت سے تیار کی ہے اور اسے پنجاب کی عیسائی انجمنِ ادب جلد شایع کرنے والی ہے۔

ہندستانی عیسائیوں کو دعوت دی گئی ہے کہ ایک انعامی مقابلے

میں حصّہ لیں۔ ان میں سے جس کا مضمون بہترین ہوگا اُسے دو سو رُپے کا انعام ملے گا۔ مضمون انگریزی، ہندستانی یا بنگالی میں لکھا جا سکتا ہے۔ عنوان یہ ہے: "انجیل نے عیسائیت کو جس طرح پیش کیا ہے وہی دنیا کا واحد دینِ حق ہے"۔

'برٹش اینڈ فارین بائبل سوسائٹی' اسی جوش و خروش سے اپنا کام کر رہی ہے۔ اس نے ہندستان کی ۴۸ مختلف زبانوں میں انجیل کے ترجمے چھاپے ہیں۔

اس ملک کے نو عیسائیوں نے ایک قسم کا قومی کلیسا قائم کر رکھا ہے جس میں حسبِ ضرورت وعظ کیے جاتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے عیسائی تو سچ مچ کا 'ہندستانی کلیسا' بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایک رسالے میں انھوں نے اس خیال کی تشریح بھی کی ہے۔ چناں چہ پچھلے ستمبر کے موقع پر امرت سر میں عیسائیوں کے ایک زبردست مجمع کے آگے اُردو میں وعظ کہے گئے اور خطبے پڑھے گئے۔ دُعا اور نماز بھی اُردو میں ادا کی گئی۔ کئی متقدر نو عیسائیوں نے اُردو میں تقریریں کیں۔ غرض کہ اس مذہبی جلسے کی ساری کارروائی اُردو میں ہوئی۔

چوں کہ عیسائیت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اس لیے قدامت پرست ہندو اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کی 'شُدھی' کی ترکیبیں سوچ رہے ہیں۔ پنجابی نے اس قسم کی ایک مثال دی ہے۔ ہیرانند نامی نوجوان مشن اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں کی تعلیم سے متاثر ہو کر وہ عیسائی ہو گیا۔ بعد ازآں توبہ کر کے وہ ہندو بن گیا اور پاپ دھونے کے لیے گنگا تک گیا، لیکن واپسی سے کے۔ و قت

[redacted]

سہارن پور میں کچھ پادریوں سے اس کی مُڈبھیڑ ہوئی۔ ان سے مل کر وہ دوبارہ عیسائی ہوگیا۔ لیکن گھر لوٹ کر وہ ازسرِنو تائب ہوگیا۔ اس مرتبہ ہندوؤں نے یہ سارا معاملہ سوامی دیانند سرسوتی کے آگے پیش کیا کہ وہ ایسے منافقوں کی 'شدھی' کے لیے کوئی قاعدہ بنا دیں۔ سوچ بچار کے لیے ایک سبھا ہوئی اور بڑے غور و خوض کے بعد اس نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ پنچوں نے کہا کہ ہیرانند کو ہندو دھرم کی پناہ لینے کا ایک اور موقع دیا جائے کیوں کہ اس کے والدین غریب اور جاہل ہیں اور انھیں مذہبی تعلیم حاصل نہیں۔ سبھا میں نامور پنڈت شردھا رام نے کہا کہ: "کبھی پردیسوں میں ہمارے ملک کا بڑا نام تھا۔ لیکن آج وہ اتنا خوار ہے کہ لاکھوں ہندستانی اپنا دھرم چھوڑ کر غیر مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ اس حالت میں یہ دھرم کیوں کر ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے سب کچھ قربان کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان اور عیسائی کتنی بڑی تعداد میں اس ملک میں رہتے ہیں۔ یہ سب یورپ یا عرب سے نہیں آئے۔ یہ سب ہمارے ہندو بھائی ہیں جو ہمیں چھوڑ کر غیروں سے مل گئے۔ اگر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور یہ ازسرِنو ہماری جماعت میں آنا چاہیں تو ہمیں ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے کئی آدمیوں کی شدھی کی رسم ادا کی۔ پنڈت جی کے علم و فضل کا بڑا شہرہ ہے، لیکن ہم ان کے کمالات کا قائل نہیں۔

بہت سے ہندو باقاعدہ عیسائی نہیں ہوتے لیکن ایک ایسے مذہبی فلسفے کو ماننے لگتے ہیں جو دینِ عیسوی سے بہت قریب ہے۔ اس کی

ابتدا راجا رام موہن رائے نے کی تھی جن کے پیرو برہمو سماجی کہلاتے ہیں۔ اس مشہور مصلح کی کوشش تھی کہ اس کے اہلِ وطن بُت پرستی چھوڑ کر وحدت کے پجاری ہوجائیں۔ ان کے بعد دیبندر ناتھ ٹیگور اور بابو کیشو چندر سین نے سماج کی رہبری کی اور اس کا حلقۂ اثر سارے ملک میں پھیل گیا۔ ایک انگریز خاتون سوفیہ ڈابسن نے اس کے اصولوں کو یورپ میں مقبول کرنے کا بیڑا اٹھایا ہی۔ میں نے ان کے مطبوعہ کتابچے دیکھے ہیں جن میں اس نئے مذہب پر نہایت دل چسپ معلومات جمع کی گئی ہیں۔

ہندو جماعت میں ہر طرف اصلاح کی ہوا چل پڑی ہی اور بہت سے لوگ جو برہمو سماجی نہیں ہیں، بُت پرستی کے خلاف ہیں اور صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ سوامی دیانند سرسوتی کو لیجیے۔ اس سال گرمیوں میں وہ لاہور میں تھے۔ وہاں ہر روز وہ مورتی پوجا کے خلاف تقریر کرتے تھے اور قدیم ہندو مت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایشور کے ماننے والے ہیں اور انھیں اس سے بحث نہیں کہ اسے کس نام سے یاد کیا جاتا ہی۔ تاہم برہمو سماج سے کئی معاملوں میں ان کا اختلاف ہی۔ برہمو سماج آواگون کا قائل نہیں لیکن آریہ سماج اسے مانتا ہی۔ البتہ سماجی اصلاح کے معاملے میں دونوں رضامند ہیں۔ دونوں بیواؤں کی شادی کے حق میں اور صغر سنی کی شادی کے خلاف ہیں۔ برہمنوں کا اعتراض ہی کہ سوامی دیانند سنسکرت میں شُدبُد کر سکتے ہیں اور ویدوں کی زبان سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے ویدوں کے ترجمے میں انھوں نے فاش غلطیاں کی ہیں۔

بہرحال پڑھے لکھے ہندو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مذہب میں کئی باتیں اصلاح طلب ہیں۔ اگر اصلاح نہ ہوئی تو بہ قول ایک ہندو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسی زمانے میں لندن میں پادری رابرٹ میٹر ہم سے بچھڑ گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ وہ بہت عرصے ہندستان میں رہ چکے تھے اور میرزا پور سے خیر خواہِ ہند نامی اخبار اردو میں نکالتے تھے۔ انجیل کے اردو ترجمے کی نظرِ ثانی انھوں نے حال ہی میں ختم کی تھی۔ انجیل کے حصۂ جدید کو انھوں نے جس حسن و خوبی سے اردو کا جامہ پہنایا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اس سانحے کے دوسرے دن ۲۲ اپریل کو لندن میں مسٹر ایلن کا انتقال ہوگیا۔ وہ 'ایلن انڈین میل' کے مدیر تھے جس کا حوالہ میں بارہا اپنے مقالوں میں دے چکا ہوں۔ لندن میونسپلٹی میں وہ ایک بہت بڑے عہدے پر متعین تھے۔ وہ میرے دوست تھے اور میں ان کے والدِ محترم کو بھی جانتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناشر تھے۔

یہ سن کر آپ کو افسوس ہوگا کہ ۷۵ سال کی عمر میں مس میری کارپینٹر نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہندستان کی خدمت کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور چار مرتبہ اس ملک کا سفر کیا تھا۔ انھی کے والد کے گھر مشہور ہندستانی لیڈر راجا رام موہن راے کا انتقال ہوا تھا۔ راجا صاحب نے مس کارپینٹر پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ انھوں نے ہندستان کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ ہندستان کے جیلوں کی اصلاح اور زنانہ تعلیم کے فروغ میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہندستان کا آخری سفر انھوں نے ڈیڑھ سال پہلے کیا تھا۔

انھی دنوں کلکتہ میں ۷۷ سال کی عمر میں رام ناتھ ٹیگور کا انتقال ہوا۔ وہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے بانی اور وائس راے کی کونسل

[illegible]